گلِ مہر

رنگا رنگ نگارشات کا اِنتخاب

اسی مصنّف کی دیگر کتب

۱۔ تاش کا کھیل

۲۔ کاک ٹیل

۳۔ دشتِ خیال

۴۔ دوسری برفباری سے پہلے

گل مہر

کرشن چندر

رفعت پبلشرز

۴۳- شاہراہ قائداعظم، لاہور

(جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں)

ناشر: ریاض ملک - مالک رفعت پبلشرز لاہور
طابع: آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس ۱۳۸، اُردو بازار - لاہور
بار: اوّل - فروری ۱۹۷۵ء
کتابت: محمّد صدیق بسرا
قیمت: چھ روپے پچاس پیسے

اپنے قارئین کے نام ——— !

کرشن چندر

"کرشن چندر"

کسی ایک قوم، ایک فرقے، یا ایک نسل کا ادیب نہیں۔
وہ ساری انسانیت کا ادیب ہے!

ترتیب

۱۔ آئینے کے سامنے۔	۹
۲۔ گل مہر۔	۲۱
۳۔ چھٹی لینا۔	۳۰
۴۔ اندھیرے کا ساتھی۔	۳۷
۵۔ صاحبان صدر کی اقسام۔	۵۳
۶۔ چندرو کی دنیا۔	۶۲
۷۔ جہاں ہوا نہ تھی۔	۷۸

۸۔ مچھلی جال۔	۸۴
۹۔ مجھے کسی سے نفرت نہیں	۹۸
۱۰۔ روشنی کے کیڑے۔	۱۰۹
۱۱۔ ڈنر۔	۱۳۲
۱۲۔ چوراہے کا کنواں۔	۱۳۵
۱۳۔ اجنبی آنکھیں۔	۱۴۴
۱۴۔ بُرے پھنسے۔	۱۵۵
۱۵۔ مٹی کا تیل۔	۱۶۳
۱۶۔ ہاتھی دانت کا ٹاور۔	

آئینے کے سامنے

ہر انسان کو آئینے کے سامنے اپنی صورت اچھی نظر آتی ہے، نہ آئے تو وہ آئینہ دیکھے ہی کیوں؟ اس میں آئینے کا اتنا قصور نہیں ہے، جتنا دیکھنے والے کا۔ دراصل ہر انسان آئینہ دیکھتے وقت اپنے اندر سے ایک دُوسرا آئینہ نکال کر اُسے پہلے آئینے میں چھپا کر رکھ دیتا ہے۔ اور اس میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ پھر یکایک دُنیا بدل جاتی ہے، بچہ جوان ہو جاتا ہے، قاتل فرشتہ بن جاتا ہے۔ میں اندر کے آئینے کو توڑ دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ کیونکہ اسی عمل سے پیاسے کو پانی ملا ہے۔ بھوکے کو روٹی ملی ہے اور جاہل نے تہذیب کا گیت سُنا ہے۔ یہ خود فریبی سراسر دھوکہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بدل دینے کی ایک لاشعوری کوشش بھی ہے۔

جب کوئی شخص اپنی تعریف کرتا ہے، تو وہ صرف یہ نہیں کہتا "دیکھو، دیکھو، میں کتنا خوبصورت ہوں۔" وہ یہ بھی کہتا ہے، "ہائے، میں کتنا اچھا ہو سکتا تھا!" اُس کی تعریف میں خود اسکی محرومی

کا راج اور اس کے مستقبل کی تلاش چھپی ہوئی ہے اور یہ محرومی ہر انسان کے حصے میں آتی ہے ، چاہے وہ ادیب ہو، پڑھئی ہو یا وزیر اعظم ہو، محرومی سے کوئی خالی نہیں ہے ۔

ممکن ہے آپ نے اپنی زندگی میں چند مکمل آسودہ انسان دیکھے ہوں ۔ میں نے بھی دیکھے ہیں ۔ خوب کھائے پیے ، پیٹ بھرے ، عمدہ کپڑوں ، گھروں ، رشتوں میں گھرے ہوئے ، خوبصورت ، صحت والے ، گول مٹول چہروں والے انسان ، جن کی زندگی میں کوئی تلاش نہیں ۔ جذبات میں کوئی ہیجان نہیں ، دماغ میں کوئی سوچ نہیں ، دل میں کوئی آئینہ نہیں ۔ انہیں دیکھ کر میرے دل کے آئینے میں کسی انسان کی صورت نہیں بنتی ، زیادہ سے زیادہ ایک اُبلے ہوئے آلو کا خیال آتا ہے ۔

لیکن اس وقت میں آلوؤں کی بات نہیں کرنا چاہتا ۔ انسانوں کی بات کرنا چاہتا ہوں ، جو میری اور آپ کی طرح شب و روز آئینہ دیکھتے ہیں ، کچھ کھوجتے ہیں ، کچھ تلاش کرتے ہیں ۔

میں اپنے دل کا آئینہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں ، تاکہ آپ ، اس میں میری صورت دیکھ لیں اور کسی حد تک اپنی بھی ۔

مَیں کیوں پیدا ہوا ؟ اس کا جواب میں کیا ، میرے ماں باپ بھی نہیں دے سکتے ۔ کسی ماں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُس کا بیٹا بڑا ہو کر قاتل ہوگا ، ورنہ وہ اُسے پیدا ہی نہ کرتی ، غالباً مریم کو معلوم نہ تھا کہ اس کا بیٹا عیسیٰ مسیح ہوگا ۔ ورنہ وہ اُسے سُولی سے بچا لیتی ۔ مائیں بڑی رحم دل ہوتی ہیں ۔ مجھے یقین ہے ، اگر مائیں اپنے دل کے آئینے میں شروع سے آخیر تک اپنے بچے کی زندگی دیکھ سکتیں تو آج صفحۂ ہستی پر کسی انسان کا وجود نہ ہوتا ، یا فرشتے ہوتے یا پھر اُبلے ہوئے آلو ۔ ایک ہی بات ہے !

اس لئے سنِ ولادت ، یوم ولادت اور جائے ولادت اہم نہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ جب میں پیدا ہوا اور زندگی کے آئینے میں مَیں نے اپنی صورت دیکھی ، تو مَیں رویا تھا ۔

بچپن کی کچھ دھندلی دھندلی صورتیں یاد ہیں۔ راجہ صاحب کے محل کا ایک حصّہ تھا۔ زرد دیواروں
کے کنگوروں اور برجیوں سے گھرا ہوا ایک چوکور صحن تھا۔ میرے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس
پر مکھن لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں دودھ کی کٹوری تھی۔ دیوار سے ایک کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا آیا
اور چونچ مار کر میرے ہاتھ سے روٹی چھین کر لے گیا۔ ایک برجی سے ایک بندر چھلانگ مار کر آیا اور
میرے ہاتھ سے دودھ کی کٹوری چھین کر چلتا بنا اور میں ایک بے بس بچے کی طرح خالی ہاتھ بیٹھے
فرش پر بیٹھا بیٹھا زور زور سے رونے لگا۔ اُس کے آگے کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں۔ غالباً میری ماں
میرا رونا سُن کر بھاگی بھاگی آئی ہو گی۔ اُس نے مجھے فرش سے اُٹھا کر اپنے گلے لگا لیا ہو گا۔ مجھے پھر
سے دودھ، روٹی اور مکھن دیا ہو گا۔ مگر مجھے کچھ یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بندر نے میرا
دودھ چھینا تھا، ایک کوّے نے میری روٹی اور مکھن۔ تین برس کی عمر میں اپنے عہد کی انسانی زندگی
کے ایک بہت بڑے المیے سے آشنا ہوا۔ جہاں ہر وقت ہر انسان کی روٹی اور مکھن چھن جانے کا
اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس وقت یہ بات معلوم نہ ہوئی کہ میرا اپنا دودھ، روٹی اور مکھن بھی کسی
دوسرے بچے کا چھینا ہوا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ مزدور
روٹی کی پوٹلی باندھ کر کارخانے کیوں جاتے ہیں۔ بیویاں رات کو دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے خاوندوں
کا انتظار کیوں کرتی ہیں، کلرک سہمے سہمے دفتروں کو کیوں جاتے ہیں، اور سر جھکا کر گویا آسمان سے
برستی ہوئی گالیاں کیوں سنتے ہیں، اور اب میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ لوگ خود غرض کیوں ہوتے
ہیں۔ اپنے دوست کو دھوکا کیوں دیتے ہیں۔ بینک میں کیوں پیسہ جمع کرتے ہیں، ان سب کے
ذہن میں کہیں نہ کہیں میری طرح کوّا منڈلاتا رہتا ہے۔

ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، اس کا نام چندر مکھی تھا۔ اور وہ اپنے نام کی ہی طرح بے حد
حسین تھی اور وہ تپتی دوپہروں میں املی کے پیڑوں تلے میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ خود بعد میں

کھاتی تھی، املی توڑ کر پہلے میرے ہاتھ میں دیتی تھی اور میں اس قدر خود غرض تھا کہ کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ لڑکی اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی املی کس طرح دوسرے مرد کے حوالے کر سکتی ہے۔ چاہے وہ اس کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے بہت بڑی بھی نہیں تھی۔ پھر بھی جب میں اس کے پیچھے چلتے چلتے تھک جاتا اور رونے لگتا تھا تو وہ چھوٹی سی لڑکی ہمت کر کے مجھے اُٹھا کر اپنی کمر پر رکھ لیتی تھی اور پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان پسینہ پسینہ ہوتی ہوئی مجھے چند گز تک چلی جاتی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی کیوں دوسرے کو اُٹھائے، اُسے پچکارے، پیار کرے، اس کی حفاظت کرے۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔

پھر ایک دن چندر مکھی کی شاہرگ کے قریب ایک خوفناک ناسور اُبھرا اور کئی سال تک میرے والد مختلف جگہوں پر اس کا اعلان کرانے کے لئے گھومتے رہے۔ مجھے اسپتالوں کے کمرے بہت یاد ہیں۔ دواؤں کی بو، اور مریضوں کا تڑپنا اور اسپتال کے ملازموں کی بے رحمی، اور پیپ اور خون، اور پٹیاں اور نیم اندھیرے کمرے میں چندر مکھی کا میری ماں کے سینے سے لگ کر بلکنا..... اچھا ہوا وہ بہت جلد مر گئی اور میں بہت جلد اپنی زندگی کے انجام سے واقف ہو گیا۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ موت بے رحم کیوں ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ اسپتال بے رحم کیوں ہیں؟ وہ اگر ایک ناسور ٹھیک نہیں کر سکتے تو دوسرا تو نہ دیں۔

مرتے وقت چندر مکھی کا چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ وہ آٹھ سالہ لڑکی ایک اسی سالہ معمر عورت کی باوقار متانت کے ساتھ مری تھی۔ ایسے میں شاید چندر مکھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس زندگی میں یہ ایک عجیب بات ہے اور شاید ایک خوبصورت بات بھی ہے کہ اس زندگی میں آنے کا پتا نہیں چلتا، لیکن اکثر جانے کا پتا چل جاتا ہے۔ کوئی ایک اندر کی انجانی حس ہوتی ہے، جو دل پر انگلی رکھ دیتی ہے اور مسافر چونک کر سفر کے لئے بیدار ہو جاتا ہے۔

چندر کھی کے ساتھ بھی اس صبح یہی ہوا۔ وہ چونک کر اُٹھی، اُس نے میری ماں کو جگایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کا منہ دھلا دے، اُس کی فراک بدل دے، اُس کے بالوں میں ربن لگا دے۔ شاید وہ ربن موت کا تحفہ تھا، جسے چندر کھی نے بڑی بہادری سے پہن لیا تھا۔ پھر چندر کھی نے مجھ سے بہت بہت پیار کیا، مجھے ایسی ایسی دعائیں دیں، جو ایک بہن ہی اپنے بھائی کو دے سکتی ہے پھر اس نے اپنے باپ کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور میری ماں نے اس کی ٹانگیں اپنی آغوش میں لے لیں اور۔ وہ بہادر لڑکی چراغ کی لَو کی طرح آہستہ۔ آہستہ کم ہوتی ہوئی میری آنکھوں کے سامنے بجھ گئی ــــ

دوسروں کے لئے تو نہیں، ہاں میرے لئے چندر کھی کی یہ چند دھندلی دھندلی یادیں اور تصویریں کسی نہ کسی طرح سے میرے ذہن اور شعور میں رچ بس کر اُسے عورت کی بنیادی تہذیب اور شرافت سے آگاہ کرتی ہیں۔ ماں سے تو گویا بچہ اس کی آنول سے بندھا ہوتا ہے۔ عورت کی لطافت کا پہلا بستی اُسے اپنی بہن سے ملتا ہے اور آخری اپنی محبوبہ سے اور یونہی اور اسی طرح اس کے دل کے آئینہ خانے میں محبت کا تصور مکمل ہوتا ہے، اس بیچ میں اور بہت سے مقام آتے ہیں، کیونکہ مرد کی محبت عورت کی محبت کی طرح صرف ایک "واحد" مکمل اور مجرد تجربہ نہیں ہے، ایک مسلسل سفر ہے۔ اپنی محبوبہ تک پہنچنے کے لئے۔ جس میں کبھی کبھی ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ مگر میں اُس کا ذکر آگے کروں گا۔

لیکن اس سے بھی بڑا کام جو چندر کھی نے کیا، وہ یہ تھا کہ اس نے میرے دل سے موت کا ڈر نکال دیا۔ ناگزیر ہونے کے باوجود موت کا تصور ہر زندہ شے کے لئے بڑا بھیانک ہے اور جُوں جُوں زندگی اپنے انجام کے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اس تصور کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اس انجام کو کوئی روک نہیں سکتا، پچاس برس کی عمر میں نہ سہی تو سو برس کی عمر میں یا ڈیڑھ سو

برس کی عمر میں ہمیں اس انجام کو پہنچنا ہے۔ ناسور سے نہ سہی تو کسی دوسرے مرض سے ۔ حادثے سے قتل سے، شہادت سے یا طبعی موت سے ہمیں ایک نہ ایک دن اس انجام کو پہنچنا ہے۔ یہ ایک قطعی امر ہے لیکن اس قطعیت سے بھی دل کو قرار نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی مذہب اور افکار اور فلسفے کا کوئی سلسلہ موت کے قرب اور خاتمے کے خوف کو انسان کے دل سے پوری طرح نکال دینے سے قاصر ہے۔ اس ڈر سے بچنے کے لئے شاید ایک بچے کے ذہن کی شاعری اور معصومیت کی ضرورت ہے، جو موت کو ایک ربن کی طرح پہن لے اور مسکراتے ہوئے اس طرح دنیا سے رخصت ہو جائے جس طرح ایک ملگجی صبح کو چند رکھی رخصت ہوئی تھی۔ میں ایک کمزور انسان ہوں، مگر جی اسی طرح مرنے کو چاہتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ جب زندگی ختم ہو جائے اور موت کا فرشتہ میری روح قبض کر کے لے جائے، تو میں مسکرا کر اس کا سواگت کروں۔ ایک دوست کی طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دور دراز کے کسی جزیرے میں لے جا کر اُسے ایک ایسی طویل اور خوبصورت کہانی سناؤں، جسے سُن کر وہ حسین خیالوں میں کھو جائے اور چند ساعتوں کے لئے کسی بچے کی جان لینا بھول جائے۔ ادیب جب کہانی لکھتے ہیں تو وہ دراصل موت سے لڑتے ہیں۔ کسی انسان کی زندگی بھی مہابھارت سے خالی نہیں رہی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ خود ہی "کورو" خود ہی "پانڈو" ہے خود ہی "کرشن" ہے، خود ہی "ارجن" ہے۔ وہ خود ہی رتھ میں بیٹھتا ہے اور خود ہی اُسے چلا کر کارزارِ حیات میں لے جاتا ہے اور اُنگلی اُٹھا کر کہتا ہے۔ 'سُن' اے ارجن!

میرے لڑکپن اور جوانی کے دن بڑے خوبصورت رنگوں سے معمور ہیں۔ کشمیر کی جھیلیں اور آبشاریں، پہاڑ اور وادیاں، دھان کے کھیت اور زعفران کی خوشبو، گھٹا — عورت کی آنکھوں کی طرح برستی ہوئی، اور برف کے گالے — سفید گلاب کی پتیوں کی طرح بکھرتے ہوئے۔ لوگوں نے دھنک کے سات رنگ دیکھے ہوں گے۔ لیکن میں نے اس میں اتنے رنگ دیکھے ہیں جو

میری دو زندگیوں کے لئے کافی ہیں۔ لیکن زندگی تو صرف ایک ہے اور ادیب بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ حساس ہوتا ہے، اس لئے میں کیا کروں ان آنکھوں کا کہ میں نے دھنک کے رنگ ہی نہیں دیکھے۔ ان میں کھڑے ہوئے کسانوں کو بھوکا بھی دیکھا ہے۔ میں نے زعفران کی خوشبو ہی نہیں سونگھی۔ اس بدبُو کو بھی سونگھا ہے، جو متعفن کپڑوں اور گلے سڑے چیتھڑوں سے آتی ہے۔ اور برف کے بے داغ گالوں میں لوگوں کو سردی سے ٹھٹھرتے اور مرتے بھی دیکھا ہے۔ اب کوئی آنکھ، کان، دل اور دماغ بند کر کے کیسے لکھ سکتا ہے؟..... اندر کی دنیا! — اندر کی دنیا کے بارے میں میں نے بہت کچھ سوچا ہے۔ لیکن مجھے آج تک یہی معلوم نہ ہوا کہ اندر کی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور باہر کی دنیا کہاں پر ختم ہوتی ہے۔ مجھے تو اندر اور باہر کی دنیا ایک سی نظر آتی ہے۔ میرے دل کے اندر جو آئینہ ہے، اُس کا ایک ایک ٹکڑا میں نے زندگی کی سڑکوں، بازاروں، گلیوں، محلوں اور چوکوں سے چُنا ہے۔ ایک ٹکڑا میں نے عورت کی سنگار میز سے اٹھایا ہے، تو دوسرا، کوڑے کے ڈھیر سے۔ ایک ٹکڑا مجھے جھیل میں غوطہ لگاتے ہوئے تہ آب سے ملا تھا، تو دوسرا صحرا کی ریت چھانتے ہوئے۔ ایک ٹکڑا ترشا اور جا کر نگینے کی طرح انگوٹھی میں لگ گیا، تو دوسرا دھار دار ہو کر تلوے میں اُتر گیا۔ شاید میری زندگی کانچ کی ان کرچیوں کو جمع کرتے کرتے گزر جائے گی اور پھر بھی دل کا آئینہ خانہ مکمل نہ ہو سکے گا، اس لئے میں مکمل طور پر آپ کو اپنے بارے میں کبھی نہ بتا سکوں گا۔ کیونکہ میں خود مکمل نہیں ہوں اور میں اس لئے مکمل نہیں ہوں، نہ بدی میں نہ نیکی میں، نہ خوبصورتی میں نہ بدصورتی میں، نہ تخیل میں نہ حقیقت میں۔ نہ تشنگی میں نہ سیرابی میں، کسی طرح بھی مکمل نہیں ہوں، کیونکہ ابھی میری نظر میں میرا خدا بھی مکمل نہیں ہے۔

لیکن میں اسے مکمل ضرور کر دینا چاہتا ہوں، اگر وہ ایک گھر ہے تو میں اس میں ایک اینٹ ضرور لگا دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ایک آئینہ ہے، تو اس میں کانچ کا ایک اور ٹکڑا جوڑ دینا چاہتا

ہوں اگر وہ دھنک ہے تو اس میں ایک رنگ اور سمو دینا چاہتا ہوں۔ میں بے نور آنکھوں کے سارے گڑھے پاٹ دینا چاہتا ہوں اور انہیں جھیلوں کی طرح لبریز کر دینا چاہتا ہوں۔ زندگیاں جو پہاڑ کی طرح بلند ہوں۔ فراغتیں جن سے زعفران کے پھولوں کی مہک آئے۔ ہمدردیاں جو آبشار کی طرح انسانوں کے سینے سے بہتی ہوں۔ کپڑے جو درختوں کے پتوں کی طرح شفاف اور چمکنے اور سورج کی کرنوں سے نمو حاصل کرتے ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ سورج کی ہر کرن میری ساتھی ہے۔

اکیلے لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ میں نے تو اپنی بھوک میں بھی اپنے آپ کو تنہا نہیں پایا۔ میری پیاس کبھی صرف میری نہیں رہی۔ میری بیکاری میں کروڑوں لوگ شامل رہے اور بہت سے ملکوں کے اور کئی صدیوں کے۔ میں ایک ہجوم ہوں، قافلہ ہوں، سفر ہوں، تاریخ کا چلتا ہوا سانس ہوں، میں ایک معمولی آدمی نہیں ہوں۔

نہ جانے یہ کیسے تصور کر لیا ہے کہ ادیب اس دنیا کا آدمی نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی دوسرے نظام شمسی کی مخلوق ہے۔ عجیب عجیب باتیں اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ایسی نیکی جو فرشتوں سے بھی ناممکن، ایسی پاکبازی جو دیوتاؤں کے حصے میں بھی نہیں آئی، ایسی سچائی جسے چھوتے ہوئے خدا بھی ڈر جائے، لیکن یہ سب صفات نہ جانے کیسے ایک دم ایک ادیب کی فطرت میں دیکھ لی جاتی ہیں۔ یا مان لی جاتی ہیں، یا خود گھڑ لی جاتی ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایک ادیب اتنا ہی جھوٹا، لباڑیا، دھوکے باز، خود غرض، کمینہ اور تنگ دل ہوتا ہے، جتنا کوئی دوسرا آدمی ہو سکتا ہے، اور مجھ میں بھی یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میں نے بارہا جھوٹی قسمیں کھائی ہیں۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے دیئے ہیں۔ خوشامد کی ہے، لڑا ہوں، جھگڑا ہوں، شراب پی ہے۔ بھنگ اور چرس

بھی۔ میں اپنی تعریف سے خوش ہوا ہوں۔ اور دوسروں کی تعریف سے جل مرا ہوں، جب کسی سے کام پڑتا ہے تو میں اس کے پیچھے لگ جاتا ہوں اور کام ہوتے ہی اُسے ایسے فراموش کر دیتا ہوں جیسے وہ کبھی میری زندگی میں تھا ہی نہیں۔ کئی بار میرے دوستوں نے مجھ سے اُدھار مانگا اور میری جیب میں پیسے تھے اور میں نے نہیں دیئے۔ کئی بار جب میں نے اُدھار مانگا اور مجھے پیسے نہیں دیئے گئے، تو میں نے دل ہی دل میں اپنے دوستوں کو گالی دی۔ کئی بار میں نے سڑکوں پر چلتی ہوئی اجنبی عورتوں کو اغوا کر لیا۔ کیونکہ وہ خوبصورت تھیں۔ اب اگر وہ صحیح سلامت حفاظت سے اپنے گھر چلی گئیں، تو یہ ان کی اور قانون کی خوش قسمتی ہے، ورنہ جہاں تک میرے ارادے کا تعلق ہے، میں اغوا کر چکا۔ اسی طرح کئی بار کسی کی بات سے طیش کھا کر میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ اب اگر وہ شخص زندہ ہے اور چلتا پھرتا ہے، تو محض اپنی قوت کے بل بوتے پر، ورنہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اُسے قتل کر چکا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اب تک میں اسی طرح پچاس عورتیں اغوا کر چکا ہوں اور دو سو آدمی قتل کر چکا ہوں۔ ان میں خواجہ احمد عباس علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، ماؤ تسے تنگ، ونسٹن چرچل، دلیپ کمار، دھرم ویر بھارتی اور مہندر ناتھ میرا سگا بھائی بھی شامل ہے اور گنتو، گلی کی بھنگن، جو میرے گھر میں ٹھیک طرح سے جھاڑو نہیں دیتی ہے اور رام دیال ٹکڑ کا بنیا، جس کا بل میں نے چھ ماہ سے ادا نہیں کیا ہے اور وادو رہیر کٹنگ سیلون کا عبدل حجام، جو ہر ماہ مجھے بال اُگانے کا ایک تیل بیچ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور میرا لینڈ لارڈ، جسے میں ہر ماہ کی پہلی کو قتل کرتا ہوں کمبخت ہر دوسرے ماہ کی پہلی کو پھر دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے، ایسا معجزہ تو آپ نے بھی دیکھا ہو گا۔

فطرت نے یکسانیت کو توڑنے کے لئے تضاد کے عمل کو تجویز کیا اور روشنی اور اندھیرا، پانی اور آگ، مرد اور عورت ظہور میں آئے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ مرد اور عورت صرف بچہ

پیدا کرنے کے لئے مامور کئے گئے ہیں، ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے ہاتھ میں بچہ پیدا کرنے کی طاقت ہوتی اور میری ران پر ایک تھیلی لگی ہوتی۔ میں اپنا ہاتھ اپنی ران میں رکھتا اور تھیلی بڑھنے لگتی اور نو ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا اور اس طرح عورت "دردِ زہ" کی مصیبت سے بچ جاتی اور فطرت عورت کی تخلیق سے۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ امیبا کی طرح چلتے چلتے میرے دو ٹکڑے ہو جاتے اور ایک کرشن چندر قُلابے کو چلا جاتا اور دوسرا ملاڈ کو۔ الگ الگ اپنی ذات میں مکمل اور خود مختار۔ مگر فطرت نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے مرد اور عورت بنائے۔ ان میں تضاد رکھا، کھنچاؤ اور کشش۔ اس کشش سے وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے، ساتھ رہنے سے گھر بنا۔ گھر کے لئے محنت کی گئی، محنت سے سماج پیدا ہوا اور سماج سے معاشرہ۔ یہ پیچیدہ خوب صورتی ایک دوسرے میں گتھی ہوئی۔ ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہوئی، وہ لچک اور حُسن توازن نہ پیدا کر سکتی۔ اگر انسان اکیلا ہوتا اور خود ہی دوہری جنس کا حامل ہوتا۔ عورت کی تخلیق کائنات کی رمزیت کی طرف ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے۔

میری زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں۔ حالانکہ قاعدے سے صرف ایک آنی تو اچھا ہوتا، مگر زندگی کی طرح محبت بھی ایک بہت پُرتضاد عمل ہے۔ کبھی کبھی جسے محبت سمجھتے ہیں۔ وہ محض ایک پسند ہوتی ہے۔ جنسی بھوک ہوتی ہے، ماں باپ کی مرضی ہوتی ہے، خدا ترسی ہوتی ہے، اخلاقی مجبوری ہوتی ہے۔ یا صاف صاف بداخلاقی ہوتی ہے۔ ایسی محبت سے اگر شادی ہوتی ہے، تو ناکام رہتی ہے۔ گھر بنتا ہے تو ویران ہوتا ہے۔ زندگی ہوتی ہے تو ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے پھولتی رہتی ہے اور کبھی کبھی انسان کو شُبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ انسان ہے کہ کدو۔!

مجھے محبت کی سمجھ بہت دیر میں آئی اور بہت دیر تک میں بھٹکا اور بہت سے گناہوں کے داغ میں نے اپنے سینے پر لے لئے اور اپنے دل کے آئینہ خانے کو بار بار طرح طرح کی

صورتوں سے سجایا، لیکن کہیں پر مجھے وہ صورت نہ ملی۔ جس کی تلاش میں میں عرصہ سے سرگرداں تھا، کیونکہ کسی انسان کا آئینہ اُس کی محبت کے چہرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، اس لئے میں اپنے دل کے زخم لئے ہزار وادیوں میں بھٹکا سینکڑوں راتوں کے روپہلے لمحوں میں اس لمس کو ڈھونڈتا رہا۔ جسے صرف ایک بار چھو لینے سے میں کندن ہوسکتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں اور دشمنوں کے گھر میں، گلی گلی، محلے محلے میں اس چہرے کو ڈھونڈتا رہا۔ جس نقوش اور خدوخال سے میں ناواقف تھا، لیکن جو صرف میرا ہوسکتا تھا اور میں اس کا اور جب وہ چہرہ مجھے مل گیا اور میں نے اُسے پہچان لیا اور اُس نے مجھے، جب میرے گناہ اُسے اپنے معلوم ہوئے اور اس کے زخم میرے دل میں پیوست ہوگئے، تو میری تلاش ختم ہوگئی۔ اب میرا جی کسی کو قتل کرنے کو نہیں چاہتا، سب کو معاف کر دینے کو چاہتا ہے۔ سب کو گلے سے لگا لینے کو چاہتا ہے۔

لیکن زندگی باقی ہے اور اُس کے خواب ادھورے ہیں۔ میرے دشمن وزیر ہوگئے ہیں یا کنٹریکٹر، اور عظیم جاہ وحشمت کے مالک! وہ پہلے سے زیادہ شدت سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میرے دوستوں نے بھی چھوٹے چھوٹے گھر خریدے ہیں، ننھے ننھے بنگلے اور فلیٹ اور گاڑیاں اور اب ان کی نگاہوں میں آسودگی، آرام اور اطمینان کی جھلک ہے اور سلام ہو ان کی زندگیوں پر اور دنیا کی تمام برکتیں نازل ہوں میرے تمام دوستوں اور دشمنوں پر، کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں۔

میں نے کوئی گھر نہیں بنایا اور کسی کو بہت بڑا فیض نہیں پہنچایا اور کبھی بڑا نہیں بن سکا۔ کیونکہ میں نے صرف خواب دیکھے ہیں۔ وہ سب ادھورے خواب تھے، سب جھوٹے سپنے تھے۔ ایک دن میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ اس دنیا کے سب انسان برابر ہیں۔ وہ ایک جھوٹا سپنا تھا۔ ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اس دنیا میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ بھی ایک

جھوٹا سپنا تھا۔ ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ اس کرۂ ارض پر سب انسان امیر ہو گئے ہیں۔ یعنی سب نے مل کر ایک دوسرے کی عزیبی آپس میں بانٹ لی ہے۔ وہ بھی ایک جھوٹا سپنا تھا۔

لیکن یہ جھوٹے سپنے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہی میرا گھر، یہی میری محبت، میری زندگی اور اس کا حاصل ہیں۔ میں ہرگز ہرگز کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میری کل کائنات یہ جھوٹے سپنے ہیں۔

گل مہر

الیکشن کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ پولنگ کا دن آگیا۔ میں نے اپنی بیوی سے پوچھا:۔
"اے نیک بخت تم کسے ووٹ دو گی؟"

ہمارے حلقہ میں سے پانچ امیدوار تھے۔ حاجی عبدالرزاق کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے تھے۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ کسی ٹکٹ پر بھی کھڑے ہوں باندرہ اور کھار کے علاقوں میں رہنے والے تیس ہزار مسلمانوں کے ووٹ انہی کو جائیں گے۔ کیونکہ وہ باندرہ کی بوچڑ برادری کے رہنما مانے جاتے تھے۔ دوسرے امیدوار شانتی لال ڈیسائی تھے جنہوں نے کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور جب اس میں ناکام ہوئے تو جھٹ سے پرجا سوشلسٹ ٹکٹ لے لیا۔ بڑے نیک دل اور دیانت دار سرمایہ دار تھے۔ ہمارے حلقہ کے پینتالیس ہزار گجراتیوں کے ووٹ گویا ان کی جیب میں تھے۔ باقی "گڑم بھی تو کوئی چیز ہے بھئی

اس دنیا میں۔

تیسرے جن سنگھی امیدوار پروفیسر مول چند مولوانی۔ چہرہ لامبا بلکہ لمبوترا بلکہ بالکل مولی کا سا۔ رنگ بھی مولی کی طرح سپید۔ آنکھیں بے حد ذہین اور بڑی پھرتی سے اِدھر اُدھر گھومتی ہوئیں۔ بات کرنے پر آجائیں تو سارے امیدواروں کو چپ کرا دیں۔ الیکشن میں ایسے آدمی ہی بالعموم اپنی ضمانت ضبط کرایا کرتے ہیں۔ چوتھے امیدوار چترسین چترویدی آناؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کا آدمی عرصہ سے میرے ہاں دودھ دینے آتا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ انہیں ووٹ دینا گویا ایک چوتھائی دودھ میں تین چوتھائی پانی کو ووٹ دینا ہے۔ ویسے اپنے علاقہ کے سب بھیئے لاٹھی لنگوٹ سمیت ان کے حق میں تھے۔ ٹکٹ انہیں رام راجیہ پریشد کا مل گیا تھا جو ایک عرصہ سے ایک ایسے ادنٹ کی تلاش میں تھے جس کی گردن میں وہ الیکشن کی گھنٹی باندھ دیں۔ پانچواں امیدوار ہمارا یارِ غار جان نوبل فرنینڈیز ڈی سوزا تھا جو وقت بے وقت ہمیں سودیشی شراب پسلائی کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں اپنے علاقہ کی سب سے بڑی قومی انڈسٹری کا نمائندہ ہوں۔ اس کا الیکشن کا نشان ٹماٹر تھا جس میں وہ شراب بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا۔ علاقہ کے پچیس ہزار رومن کیتھولک ووٹ اس کی پشت پناہ تھے۔ جان نوبل فرنینڈیز ڈی سوزا آزاد امیدوار تھا کیونکہ گو اس کی شراب ہر سیاسی پارٹی کے لوگ پیتے تھے۔ مگر شراب پینا اور بات ہے اور ٹکٹ دینا اور بات ہے۔

یہ پانچوں امیدوار ہمارے گھر آچکے تھے۔ شری شانتی لال ڈیسائی کے تو مکان میں ہم رہتے تھے۔ اور پانچ ماہ کا کرایہ باقی تھا انہوں نے کرایہ تو معاف نہیں کیا ہاں چلتے چلتے الیکشن کے بعد گٹر ٹھیک کرانے کا وعدہ کر گئے۔ میں نے بھی ووٹ گٹر میں ڈالنے میرا مطلب ہے انہیں دینے کا وعدہ کر لیا۔ پھر ایک روز حاجی عبدالرزاق آئے۔ ایک تو حاجی پھر کانگریسی پھر بوچڑ۔ میں نے انہیں

ہات جوڑ کے کہا۔ آپ تو ہماری حکومت کے نمائندے ہیں میں آپ کو ووٹ نہ دوں گا تو کیسے دوں گا؟

حاجی جی نے مسکرا کر کہا "یاں سرکاری بات نتھی! ہم کو تمہارا ووٹ منگتا!"

ان کے ایک حواری نے میری طرف انگلی گھماتے ہوئے کہا "یہ اردو میں لکھتے ہیں"

اردو کا نام آتے ہی حاجی جی کی باچھیں کھل گئیں حالانکہ وہ خود اردو اسی طرح بولتے تھے جس طرح وہ بکرے کے گلے پر چھری پھیرتے تھے مگر بے حد خوش ہو کر بولے "تمی اردو نا لکھاری چھے!"

حواری نے لقمہ دیا "موٹو لکھاری!" (بڑا لیکھک)

بس حاجی جی گویا میرا ووٹ اپنی موٹی توند میں ڈال کر چلے گئے۔

پروفیسر مول چند مولوانی کا انداز کچھ اس طرح کا تھا:

"سائیں تم پنجابی میں سندھی! کیوں؟" انہوں نے آنکھ مار کر میرے ہات پر ہات مارا ــــ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہم دونوں ریفیوجی! دونوں پاکستانیوں کے ستائے ہوئے! ہا ہا ہا۔ مولوانی زور سے میرے منہ کے قریب آ کر اس طرح ہنسا کہ اس کے منہ کا لعاب میری آنکھوں میں جا گرا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر سوچا کیا معلوم کل کلاں کو یہی صاحب اسمبلی کے ممبر ہو جائیں اس لئے میں نے بھی ان کی ہنسی میں ہنسی ملائی اور اپنے تھوک کا فوارہ ان کے رخساروں پر بکھیر دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک ہم دونوں جیب سے رومال نکال کر اپنا اپنا چہرہ صاف کرنے میں مصروف رہے۔

اس کے بعد پروفیسر مولوانی صوفہ سے اٹھا اور بولا: "مگر تم یونیورسٹی کے لئے ٹیکسٹ بک کیوں نہیں لکھتے ہو۔ سینٹ میں تمہاری مہربانی سے میرا اتنا رسوخ تو ہے کہ ــــ"

میں نے کہا الیکشن کے بعد لکھوں گا۔

"آل رائٹ ـــ تو ووٹ جن سنگھ ۔" مولوانی نے لہرا کر کہا۔

"جے اکھنڈ بھارت!" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔

چترسین چترویدی کے ووٹ مانگنے کا طریقہ ہمیں سب سے زیادہ پسند آیا۔ ایک روز دودھ بہت عمدہ تھا۔ میں نے حیرت میں آکر اپنی بیوی سے پوچھا۔ اس نے اور بھی حیران ہو کر دودھ والے سے پوچھا:

"ہم نے تمہارا پچھلا حساب تو سمان کر دیا ہے نا؟"

"ہاں کر دیا ہے۔"

"پھر بھی دودھ اس قدر عمدہ کیوں آرہا ہے؟"

دودھ والا مسکرایا۔ بولا۔ بی بی جی! اگر چترسین چترویدی جی کو ووٹ دو گے تو دودھ ایسا ہی عمدہ ملا کرے گا۔"

یہ اتنا بڑا لالچ تھا کہ ہم لوگ انکار نہ کر سکے مگر اس کے دوسرے دن بلدیہ ڈی سوزا شراب کی ایک بوتل لے کر میرے پاس آگیا۔

"اصلی ٹائر والا مال ہے۔"

"واقعی مال تو بہت عمدہ ہے۔" میں نے چکھ دے کر کہا۔ "بے حد عمدہ ہے۔"

ڈی سوزا خوش ہو کر بولا۔ "اب تو فارن ایکسی کے لوگ بھی یہی پیتے ہیں کہتے ہیں یہ تو انڈین جن ہے اور جو اس کے نشہ میں کِک ہے وہ اور کسی ملک کی شراب میں نہیں ہے۔ پیو!"

مجھ میں یہ بہت بُری بات ہے کہ جتنا پیتا جاتا ہوں اتنا سنجیدہ ہوتا جاتا ہوں۔ چوتھے پیگ پر میں نے ڈی سوزا کا ہاتھ روک کر پوچھا۔ "جان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی جب تک کانگریس ہے، پروہیبشن ہے۔ پھر تمہیں الگ سے اپنا نمائندہ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟"

جان پورا پیگ پی گیا۔ اُلٹے ہاتھ سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا "سنو پیارے! پروسیشن کے اندر جو دھاندلی یعنی دھندا چلتا ہے اس کا اندازہ کچھ کانگریسیوں کو ہوتا جاتا ہے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ بس اس چیز کو روکنا چاہیئے اور پروسیشن کو اسی طرح کامیاب تر بنانا چاہیے — ورنہ — ؟"

"ورنہ —" میں نے پوچھا۔

"ورنہ مجھے واپس گوا جانا ہوگا۔" ڈی سوزا نے بڑے اُداس لہجہ میں کہا۔

"نہیں دوست تم واپس گوا نہیں جاؤ گے۔ ٹائر والا مال زندہ باد" میں نے لبک کر کہا

اس طرح ہم نے پانچوں امیدواروں کو خوش کر دیا مگر پولنگ کے دن ایک ووٹ کے لئے ایک ہی پرچی ملتی ہے پانچ تو ملتی نہیں کہ ہر ایک امیدوار کو خوش کیا جا سکے۔ اس لئے پولنگ کے دن گھر سے چلتے وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ ووٹ آخر دیا جائے تو کسے دیا جائے؟ اس لیے میں نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"اے نیک بخت کسے ووٹ دو گی؟"

وہ خوش خصال اپنے دوپٹہ کو سر پہ ڈال یوں گویا ہوئی: "میں تو کانگریس کو ووٹ دوں گی۔"

"کیوں؟"

"بس کہہ جو دیا کہ کانگریس کو ووٹ دوں گی۔ کانگریس تو کانگریس ہے۔"

اس کے بعد جو اس نے بیلنا اٹھایا تھا کہ مجھے سہرا یاد آیا اور میں دونوں کان لپیٹے کچن سے باہر مگر وہ بیلنا اٹھائے میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور پوچھنے لگی:

"اور تم کسے ووٹ دو گے؟"

"میں تو اپوزیشن کو دوں گا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں؟" اس نے بیلنا ہوا میں گھمایا۔

میں نے کہا "ملک کے کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ اپوزیشن مضبوط ہو۔"

"بکواس!" میری بیوی فیصلہ کن لہجہ میں بولی اور کچن کے اندر چلی گئی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ اجی صاحب ووٹ دینا کوئی آسان کام ہے خاص طور پر ایک شادی شدہ آدمی کے لئے۔ پھر جا کے حلقہ سے ایک نہ دو پورے پانچ امیدوار کھڑے ہو جائیں؟ سرکار ووٹ دینے کا حق تو دیتی ہے، ووٹروں کی جان کی سلامتی کے لئے کیا کرتی ہے؟ — میں پوچھتا ہوں....؟

ہم لوگ گھر سے نکلے اور گلیوں میں سے گذرتے ہوئے باندرہ کے چوک پر آ گئے۔ لوگوں کی ٹولیاں ووٹ دینے پولنگ بوتھ کی طرف بڑھ رہی تھیں جسے ایک پارسی خیرات خانے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس بوتھ سے ادھر سڑک پار کر کے بس کا اسٹینڈ تھا جس کے پیچھے گل مہر کا ایک بہت بڑا درخت کھڑا تھا۔ اس کے سب پتے جھڑ چکے تھے لیکن ہر شاخ سرخ سرخ پھولوں کی شمعیں روشن کئے تھی۔ مردوں کا الگ کیو تھا، عورتوں کا الگ کیو تھا۔ میری بیوی تو عورتوں کے کیو میں چلی گئی۔ میں مردوں کے کیو میں کھڑا ہو گیا جو اتنا لمبا تھا کہ خیرات خانہ سے بس اسٹینڈ کے پیچھے گل مہر کے پیڑ تک آتا تھا کیو میں میں آخری آدمی تھا اور بالکل پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ اس پیڑ کے تنے پر کسی من چلے نے سفید پینٹ سے لکھ دیا تھا "مجھے ووٹ دو!"

درخت کو ووٹ دو؟ یہ کیا حماقت ہے، میں نے سوچا۔ پھر خیال آیا ممکن ہے کسی امیدوار کا انتخابی نشان پیڑ ہو اور کسی نے اس پیڑ کے تنے پر یوں لکھ دیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو پبلسٹی کا بہت عمدہ طریقہ ہے!

کیونکہ بہت لانبا تھا۔ میری باری بہت بہت دیر میں آئے گی جب تک کیا کروں؟ ووٹ دینے تو آگیا مگر اب تک یہ معلوم نہیں ووٹ کسے دوں؟ پانچوں امیدوار اپنے اپنے لیبلوں کے ہمراہ میرے سامنے گھومنے لگے۔

یکایک ایک بھاری پاٹ دار آواز سنائی دی ــــ "مجھے ووٹ دو!"

میں نے گھبرا کر درخت کے تنے کی طرف دیکھا۔ واقعی یہ درخت بول رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں ووٹ دوں؟"

"ہاں! گل مہر کا درخت بولا۔

"تم اس الیکشن میں امیدوار کھڑے ہو؟ کہ تم کسی کے انتخابی نشان ہو؟"

گل مہر کا درخت بولا "میں امیدوار ہوں اور یہی میرا انتخابی نشان ہے۔"

میں نے پوچھا "میں تمہیں ووٹ کیوں دوں؟"

"اس لئے کہ تم شانتی لال ڈیسائی کے گھر رہتے ہو وہ تم سے ایک چھت کے تلے رہنے کے لئے پچھتر روپے کرایہ وصول کرتا ہے اور میری چھت تلے درجنوں گداگر، غریب آدمی، بیکار، مسافر آکر سوتے ہیں اور میں ان سے ایک پیسہ کرایہ وصول نہیں کرتا۔ حاجی عبدالرزاق بکریوں کو قتل کرتا ہے۔ میں انہیں اپنے سایہ تلے پناہ دیتا ہوں۔ بکریوں کو بھی اور ان تھکے ہارے انسانوں کو بھی جو دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں سورج کی بے پناہ حدت سے گھبرا کر ٹھنڈک کی تلاش میں میری گود میں آتے ہیں۔ میرے ہرے ہرے پتے ان کے لئے پنکھا جھلاتے ہیں۔ تمہارے بجلی کے پنکھے کا کیا بل آتا ہے ــــ؟"

"ساڑھے تین روپے کبھی چار روپے۔"

"میں صرف خدمت کر کے خوش ہوتا ہوں اور اپنے گاہکوں سے کچھ نہیں لیتا۔ پروفیسر مول چند

مولوانی کے دل میں ایک خاص قوم، ایک خاص ملک، ایک خاص مذہب کے لئے کتنی نفرت بھری ہے۔ مگر میں تو کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب، کسی رنگ اور نسل کے انسان سے نفرت نہیں کرتا۔ میرا سایہ ہر ایک کے لئے ہے۔ میں تو ہر ایک کو اپنی گود میں لے لیتا ہوں، ہر ایک سے یکساں پیار کرتا ہوں اور ہر ایک پر اپنی محبت یکساں تقسیم کرتا ہوں، میں کسی جات برادری کے تفوق کا قائل نہیں ہوں۔ ہر دیانت دار آدمی کو مجھے ووٹ دینا چاہیئے۔

درخت اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس سے پوچھا "تمہیں الیکشن میں کھڑے ہونے کا خیال کیسے آیا؟" گل مہر کے پیڑ نے انتہائی رازدارانہ لہجہ میں مجھ سے کہا "چند روز ہوئے چاندنی رات تھی ایک اشتعتہ مزاج پریشان حال شخص میرے پاس آیا اور میرے تنے سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ شاعر تھا اور اس نے محبت کی تھی اور جب کہیں پر اسے اپنی محبت کا سنگم نہ ملا تو وہ میرے تنے سے آ کر لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنا محبوب جانا۔ اس نے میرے قامت کی تعریف کی۔ میری زلفوں کی بلائیں لیں، اس نے میری شاخوں کو کسی کی باہیں جانا جن کی انگلیوں کی پوریں سُرخ پھولوں سے مزین تھیں۔ رنگ حنا کی صورت اور آخر میں اس نے ان سُرخ غنچوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ انسان کا بوسہ کس قدر حسین ہوتا ہے ـــ پھر شاعر نے نگاہیں اٹھا کر میری شاخوں، میرے پتوں میرے پھولوں سے اوپر آسمان کو دیکھا اور اس کا لہجہ بدل گیا اور اس کا گیت اونچا ہو گیا اور اس نے اس پیڑ کا راگ گایا۔ وہ پیڑ جو ایک دن ساری دنیا کو اپنی پُرامن آغوش میں لے لے گا۔ جب سائے سب کے لئے ہوں گے اور پھل اور پھول سب کے لئے ہوں گے اور کوئی ہونٹ ترسے ہوئے نہ رہیں گے اور کوئی نگاہ تشنہ نہ رہے گی اور کوئی آواز نغمگی سے خالی نہ جائے گی ـــ اس لئے آؤ! مجھے گل مہر کے پیڑ کو ووٹ دو! کیونکہ میں صرف ایک پیڑ نہیں

ہوں۔ میں تو ایک خواب ہوں، ایک وعدہ ہوں، ایک تعبیر ہوں، ایک بشارت ہوں۔"

بہت دیر کے بعد جب میری باری آئی تو کسی نے میری چھنگلیا پر ووٹ دینے سے ایک سیاہ شناختی نشان لگایا تاکہ میں دوبارہ ووٹ دینے نہ آسکوں، پھر ایک صاحب نے ووٹ کی پرچی میرے ہاتھ میں تھما کر مجھے بوتھ کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ بوتھ کے باہر ایک چپڑاسی بیٹھا تھا۔

میں بوتھ کے اندر داخل ہوا۔ وہاں پانچوں امیدواروں کے بیلٹ باکس تھے۔ ہر صندوقچہ پر امیدوار کا انتخابی نشان چسپاں تھا۔ لیکن پیڑ کا نشان مجھے کہیں نہ ملا۔ میں اپنی پرچی واپس لیتے ہوئے بوتھ کے باہر آیا اور پوچھنے لگا: "گل مہر کا بیلٹ باکس کہاں ہے؟"

"گل مہر کون؟ گل مہر نام کا یہاں کوئی امیدوار نہیں ہے۔"

"ہے!" میں نے غصہ سے چلا کر کہا۔

"کہاں؟" پولنگ آفیسر نے برافروختہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔ باہر گل مہر کا پیڑ، جس کے تنے پر لکھا ہے، مجھے ووٹ دو، میں اسی کو ووٹ دینا چاہتا ہوں۔ میں اسی کو ووٹ دینا چاہتا ہوں۔ اس کا بیلٹ باکس لاؤ۔ کدھر ہے اس کا بیلٹ باکس؟"

پولنگ آفیسر نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اس نے پولیس کے دو سنتریوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس پاگل آدمی کو بوتھ سے باہر لے جاؤ۔

باہر گل مہر کا درخت مضبوطی سے اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس کے پھولوں کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم تھا اور اس کی شاخوں کی باہوں میں ایک عجیب سا بلاوا تھا۔

وہ شاعر سچ کہتا تھا۔

چھٹی لینا

ایک بار ہمارے ملک کا ایک بڑا آدمی یعنی ایک ہر دلعزیز لیڈر اتوار کو مر گیا۔ میرا خیال تھا لاکھوں لوگ اس کے جنازے میں شامل ہوں گے۔ لیکن صرف چند ہزار کا مجمع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور جو لوگ جنازے کے جلوس میں شامل تھے وہ بھی بے حد بیزار اور جھلائے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لوگ اس لیڈر سے اس لئے بیزار ہو گئے تھے اور خفا تھے۔ کہ وہ اتوار کو کیوں مر گیا۔ اگر اتوار کے بجائے سوموار کو مرجاتا تو اس کا کیا جاتا؟ ایک صاحب جو جنازے میں شریک تھے برافروختہ ہو کے مجھ سے کہنے لگے۔ تو میں نے ان سے پوچھا۔

"اگر وہ سوموار کو مرتا تو کیا ہوتا؟"

وہ بولے "ہمیں ایک چھٹی مل جاتی۔ اب وہ ماری گئی کمبخت ان لیڈروں کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔"

انگریزیوں تو ہندوستانیوں کو قابو میں رکھ کر کے باندھنے کے بڑے قائل تھے۔ مگر چھٹیوں کے سلسلے میں وہ بھی بڑے فراخ دل تھے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے دفتر ہر سال تین ماہ کے لئے کسی ہل اسٹیشن پر چلے جاتے تھے۔ جہاں کام کم چھٹی زیادہ ہوتی تھی پھر ہندوستانیوں کو انہوں نے اور کوئی آزادی دی ہو یا نہ دی ہو۔ مذہبی آزادی ضرور عطا کر دی تھی۔ اور ہندوستان میں ہر مذہب کے لوگ بستے ہیں۔ ہندو سکھ۔ مسلم۔ عیسائی۔ یہودی۔ چینی۔ بودھی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے تیج تیوہاروں اور بڑے آدمیوں کی موت کی چھٹیاں جمع کر لیجئے۔ پھر کرسمس کے دس دن آتے تھے انہیں بھی شامل کر لیجئے ایک اندازے کے مطابق ایک وقت ہندوستان پر ایسا بھی گزرا ہے۔ جب سال کے تین سو پینسٹھ دن میں تین سو ستر چھٹیاں ہوتی تھیں۔ اب بھی ہونا چاہئیں۔ مگر موجودہ حکومت انگریزوں کے زمانے کے سیکولرازم پر عمل نہیں کرتی۔ محض باتیں بناتی ہے۔ اور چھٹیاں کم کرتی جاتی ہے یعنی چھٹیوں کی چھٹنی ہوتی جاتی ہے۔

فطرتاً انسان حرام خور اور کام چور واقع ہوا ہے۔ بڑوں کی بات جانے دیجئے۔ بچے تو بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں کون سکھاتا ہے کہ وہ اسکول میں چپکے چپکے بڑے آدمیوں کی موت کی محض اس لئے دعا کرتے رہیں کہ انہیں ایک دن اسکول سے چھٹی مل سکے۔

بچپن کی عادت کبھی نہیں جاتی۔ چھٹی کا لالچ بڑوں کو بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا بچوں کو۔ کام سے ہر شخص نفرت کرتا ہے، دل ہی دل میں۔ گو کہتا نہیں ہے کام تو اسلئے کیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر روٹی نہیں ملتی ورنہ کون کام کرے۔ اسی لئے تو دفتروں میں کام کرنے کے اوقات رکھے جاتے ہیں۔ انسانوں کو دفتروں کے اندر میز اور کرسی کے اندر مقید کیا جاتا ہے۔ اسی کام کے لئے کارخانے کا بھونپو بجتا ہے۔ اسکول کی گھنٹی۔ الارم کلاک کا شور۔ بیوی سوتے ہوئے شوہر پر ٹھنڈے پانی کا گلاس اس لئے انڈیل دیتی ہے کہ اس کا شوہر وقت پر دفتر چلا جائے۔ ورنہ اس کی ہمیشہ کے لئے چھٹی ہو جائے گی۔ اور ہمیشہ کی

چھٹی سے اتنے خائف لگتے ہیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آنے لگتا ہے معلوم نہیں اصل محاورہ کیا ہے چھٹی کا دودھ یا چھٹی کا دودھ ؟ آج کل کے بہت سے محاوروں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت جوں جوں چھٹیاں کم کرتی جاتی ہے دفتروں میں کام بڑھتا جاتا ہے۔ جس دن سے ملک آزاد ہوا ہے دفتروں میں "گو سلو" "آہستہ چلو" کی پالیسی لاگو ہو چکی ہے۔ ایک دفتر کا کلرک ایک فائل کو دیکھنے میں اتنا وقت لیتا ہے جتنے وقت میں ایک آدمی چاند سے ہو کر واپس زمین پر آسکتا ہے۔ مگر وہ فائل ابھی تک اس کلرک کی میز پر پڑی ہے۔ کیونکہ وہ چائے پی رہا ہے۔ چائے کا ایک کپ ختم ہوا تو دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو اپنی میز پر چائے کے لئے دعوت دے دی ہے جو خوشی سے قبول کر لی گئی ہے۔ افسر کی میز فائلوں سے بھری پڑی ہے مگر وہ اسٹینو سے عشق لڑانے میں مشغول ہے۔ جو دوسرا افسر ہے وہ پہلے افسر کی کاربن کاپی ہے۔ آپ کا نالہ پابند نے ہے کہ نہیں ہے۔ مگر یہاں فریاد کی ایک ہی لے ہے۔ کام بہت ہے اور چائے اور چھٹی بہت کم ہے۔

چھٹی لینا۔ چھٹی کرنا۔ چھٹی پر جانا اور چھٹی کرتے رہنا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں مجھے بہار ریلیف فنڈ کے سلسلے میں ہندوستان کے پانچ صوبوں کے دورے پر چندہ اکٹھا کرنے کیلئے جانا پڑا۔ میں نے اکثر دیہاتیوں اور چرواہوں کو پیڑوں تلے تاش کھیلتے دیکھا۔ اور عورتوں کو پن گھٹ پر خالی گھڑے سامنے رکھے باتوں میں مشغول پایا۔ جی بہت خوش ہوا کہ ہندوستان آج بھی کام چوری کی اس روایت کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے جو ہزاروں برس سے ورثے میں ملی ہے۔ چنانچہ بہار کا یہ قحط کوئی نیا سانحہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے بہار کے قحط کا ذکر آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے کے سنسکرت شاستروں میں ملتا ہے۔ جبکہ آبادی بھی زیادہ نہ ہوگی۔ آسمان پر دیکھنے کی بجائے اگر اپنے ضمیر کو ٹٹولا جائے تو ہندوستان کے پچھڑنے کا راز معلوم ہو جائے گا۔ پنڈت نہرو یہ کہتے کہتے مر گئے کہ آرام حرام ہے۔ بے چارے دن میں اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ مگر ایک آدمی

ایک پوری قوم کی کاہلی اور آرام طلبی کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اس لئے بے چارے کام کرتے کرتے مر گئے مگر اس قوم کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اب اسی "جوں رینگنے" کے محاورے کو لیجئے اس سے ایک تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کتنے پاک اور صاف ستھرے رہتے ہوں گے۔ جن کے کان پر جوں رینگتی رہتی تھی اور انہیں کوئی تعجب نہ ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ بھی ہے۔ کہ آج کل کان پر جوں اس لئے نہیں رینگتی کہ وہ بھی چھٹی پر ہے۔

اس لئے آج کل ہر دفتر اور کارخانہ۔ ہالی ڈے کیمپ بنا ہوا ہے۔ نہ افسر کام کرتے ہیں۔ نہ کلرک۔ مزدور ہڑتال پر ہیں۔ اور اسکول اور کالج کے طلبا اس لئے اسکول اور کالج نہیں جاتے کہ انہیں بند ھ سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ کوئی عثمان ساگر بند ھ نہیں ہے۔ جس سے پانی پر بند ھ باند ھا جاتا ہے۔ اور بجلی پیدا ہوتی ہے اس بند ھ سے چھٹی پیدا ہوتی ہے اور بسیں۔ گھر۔ ریل گاڑیاں۔ موٹریں اور محلے جلائے جاتے ہیں۔ آج کل کے بچے پیدا ہوتے ہی دودھ مانگتے ہیں اور پھر چھٹی۔ گزشتہ جنگ میں جرمنی کا کونہ کونہ جل گیا تھا۔ آج جرمنی کا سکہ مارک مالی اعتبار سے ڈالر سے بھی اونچا ہے۔ ان بیس برسوں میں ایٹمی دھماکوں سے جلے جھلسے ہوئے جاپان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آج اس کا شمار صنعتی طاقت کے اعتبار سے چوتھے نمبر پر ہے۔ ہندوستان پہلے نمبر پر ہے مگر صرف چھٹیوں کی تعداد کے حساب سے۔ ورنہ اللہ ہی اللہ ہے۔ اور جس رفتار سے چھٹی کی ذہنیت اور فرقہ وارانہ فسادات میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی کے شغل میں ہم نے اللہ اور بھگوان دونوں کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔

سرکاری غیر سرکاری۔ مذہبی اور سکولر چھٹیوں کے علاوہ چھٹیاں حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے جس میں مرنے والے رشتے دار یوں نہیں مرتے۔ انہیں محض چھٹی حاصل کرنے کے لئے مار دیا جاتا ہے۔ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جن کا باپ نو دفعہ مر چکا ہے۔ ماں گیارہ دفعہ۔ یوں

بھی آج کل دفتروں میں افسر جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اپنے ماں باپوں کو مار کر چھٹی لینے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ میرے ایک دوست کو پور بندر میں اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ قاعدے سے اسے جتنی چھٹی ملنا تھی وہ سب لے چکا تھا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے کسی قریبی سے قریبی رشتہ دار کو مار کر چھٹی حاصل کرلے۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور چھٹی کی درخواست میں تحریری طور پر لکھ دیا کہ اس کا باپ پور بندر میں قتل ہو چکا ہے۔ اسے ایک ہفتے کی چھٹی دی جائے۔ اس درخواست کے ساتھ نتھی کر دیا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس درخواست کو خود اس کا باپ اس کے بڑے افسر کے سامنے لے کر گیا۔ کیونکہ اس میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ افسر نیا تھا۔ اور اگر نیا نہ ہوتا پرانا ہوتا جب بھی کیا ہوتا آج کل کس کو کیا معلوم ہے کون کس کا باپ ہے؟

چنانچہ اس کی درخواست منظور ہو گئی اور وہ گزشتہ ہفتے سے پور بندر میں اپنی محبوبہ کے ساتھ گل چھرّے اُڑا رہا ہے ممکن ہے اگلے ہفتے وہاں سے اس کے چچا کے مرنے کی خبر آئے۔ ہم سب لوگ اس انتظار میں ہیں۔

مگر لوگ اس سعادت سے بھی محروم ہیں۔ وہ بار بار اپنے ماں باپ کو قتل نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے ماں باپ کی نشان دہی ہو چکی ہوتی ہے۔ ان کی جائیداد کی ہو نہ ہو۔ اس لئے ان لوگوں نے چھٹی لینے کا دوسرا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ لوگ کبھی چھٹی نہیں لیتے قوم کی خاطر کبھی آرام نہیں کرتے۔ یہ لوگ اکثر دورے پر رہتے ہیں۔ جہاں چھٹی کے علاوہ سفر خرچ اور روز کا بھتہ الگ ملتا ہے۔ اور جب یہ لوگ دورے پر نہیں ہوتے تو ہندوستان سے باہر ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا نیتا ہوگا اتنا ہی زیادہ عرصے تک ہندوستان سے باہر رہے گا۔ بڑے نیتا کی پہچان یہی ہے کہ وہ کہاں تک اور کتنے عرصے تک ہندوستان سے باہر رہ سکتا ہے اور باہر کے نیتاؤں سے گفت و شنید کے

بہانے سے کتنے عرصے تک ہندوستان سے دور رہ کر چھٹی منا سکتا ہے۔

چھٹی لینے کے لئے ڈاکٹر بھی بہت سود مند ثابت ہوتے ہیں، مگر رشتے داروں کی موت کے ذریعے چھٹی میں یہ فائدہ ہے کہ ان کی موت کا سرٹیفکیٹ داخل نہیں کرنا پڑتا۔ مگر بیماری کی چھٹی میں ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے۔ جس کے لئے دام دینے پڑتے ہیں۔ جس رفتار سے سرکاری ملازمین کے رشتے داروں نے مرنا شروع کیا ہے۔ اس سے ڈر کر سنا ہے۔ گورنمنٹ یہ قانون نافذ کرنیوالی ہے۔ کہ رشتے دار کی موت کے سلسلے میں چھٹی لینے والے، متوفی کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی داخل کریں اگر یہ قانون بن گیا تو پھر چھٹی لینے کے لئے یہ سوچنا پڑے گا کہ مرحوم کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے دام زیادہ ہوتے ہیں یا ڈاکٹر کی فیس کے، میں نے اکثر بیماری کے سرٹیفکیٹ زیادہ حاصل کئے ہیں اور چھٹی حاصل کرنے کے لئے یہی میرا پسندیدہ طریقہ رہا ہے۔ چنانچہ گو میں پچھلے بیس برس سے اب تک کبھی بیمار نہیں ہوا لیکن اگر میری چھٹیوں کا ریکارڈ دیکھا جائے تو اب تک مجھے ٹائی فائڈ، چکن پاکس، اپنڈے سائیٹس اور کینسر تک ہو چکا ہے۔ اپریشن کے ذریعے میں اپنی آنکھوں کے سوا باقی سب اعضاء کا اپریشن کرا چکا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو ایک دن آنکھیں بھی نکلوا دوں گا کیونکہ چھٹی لینا لازمی ہے۔

صرف ایک بار مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں اسی کمپنی میں ملازم ہوں جس میں میرا باپ اسسٹنٹ منیجر ہے لیکن ہم لوگوں نے یہ رشتہ آج تک کمپنی والوں سے چھپا کر رکھا ہے مبادا میرے باپ پر خویش پروری کا الزام آئے۔

ایک بار کیا ہوا کہ میں نے اپنی محبوبہ کے ہمراہ وار جلنگ جانے کا پروگرام بنایا۔ پندرہ دن کے لئے چھٹی کے لئے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے جب میں نے اس سے رجوع کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

بولا۔ میرے بھائی۔ اب کس عارضے کی بنا پر تمہاری چھٹی کی درخواست پر اپنا سرٹیفکیٹ دوں۔ کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جو تمہیں لاحق نہ ہو سکی ہو۔ کوئی اپریشن ایسا نہیں ہے جو چھوٹ گیا ہو۔ سوائے اسقاط کے۔ اب کہو تو وہی لکھ دوں۔

میں کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ لائیے روپے واپس کیجئے میں اپنی درخواست میں کسی قریبی رشتہ دار کی موت کا ذکر کر دوں گا۔"

چنانچہ میں نے پندرہ دن کی چھٹی کے لئے درخواست لکھی۔ اور وجہ یہ بیان کی کہ میرے والد بزرگوار کی موت یک لخت آسام میں ہو گئی ہے۔ اور مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ آنے جانے، لاش کو واپس لانے اور کریا کرم کرنے میں پندرہ دن لگ جائیں گے۔ وجہ نہایت معقول تھی۔ اس امر کو کہ میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ دارجلنگ جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے باپ سے بھی چھپا لیا تھا۔

یہ درخواست لے کر میں چپ چاپ دروازہ کھول کر بڑے مینجر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سر جھکائے کچھ کام کر رہا تھا۔ کوئی ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے درخواست اس کے جھکے ہوئے سر کے نیچے سرکا دی۔ اس نے پہلے تو درخواست پڑھی پھر سر اٹھا کر جو دیکھا تو میں چکرا گیا۔ ایک لمحے میں دفتر کی چاروں دیواریں گھوم گئیں۔

کرسی پر میرا باپ بیٹھا تھا۔

بڑا مینجر اس دن کسی کام سے چھٹی پر گیا تھا۔ چنانچہ اس کی جگہ آج اسسٹنٹ مینجر کام کر رہا تھا اور یہ بات مجھے معلوم نہ تھی۔

اسسٹنٹ مینجر نے میری درخواست پڑھ کر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور بولا۔ ابھی چند منٹ ہوئے میں نے تمہارے باپ کو دیکھا تھا۔ ایک آئینے میں۔ اس لئے تمہاری درخواست نامنظور کی جاتی ہے۔

اندھیرے کا ساتھی

پھول وتی نے قدآدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور آئینے نے اس سے کہا۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہارے نین کٹوروں میں شراب کی سی مستی یوں چھائی رہتی ہے کہ پروہیبشن پولیس تمہیں کسی وقت بھی نشے میں گرفتار کر سکتی ہے۔ تمہارے گلابی ہونٹ پھولوں کی پنکھڑیاں ہیں جن پہ شہد کی مکھی دھوکا کھا کر کبھی بھی بیٹھ سکتی ہے۔ تمہاری چال جیسے پانی کی اٹھلاتی ہوئی لہر آواز جیسے فضا میں لچکتی ہوئی قوس قزح۔ قد جیسے۔ تم وہ عورت ہو جس کے لئے شاعر شعر کہتے ہیں۔ سیاست داں جھوٹ بولتے ہیں۔ تاجر بلیک مارکیٹ کرتے ہیں اور مولوی اور پنڈت ماتھا رگڑ رگڑ کر خدا کو یاد کرتے ہیں۔ تمہارے لئے انسان نے کیڑوں سے ریشم مانگا۔ بھوری مٹی سے کانچ پیدا کیا۔ دھرتی کی چھاتی میں گھس کر سونا حاصل کیا۔ اور سمندر میں ڈوب کر موتی تلاش کئے۔ تمہارے لئے انسان نے گھر بنایا۔ گھر کے گرد باغ لگایا۔ باغ میں پھول کھلائے۔ اور پھولوں کو توڑ کر تمہارے بالوں میں ٹانک

دیا۔ تم جو ہر انسان کی آرزو کی خوشبو ہو۔ ہر خوشبو کا صلہ ہو۔ تم آج کیوں رو رہی ہو؟"

پھول دتی نے اپنی بڑی بڑی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور سسک کر کہا۔

"ایسا ہی تھا تو پھر انہوں نے مجھے کیوں مارا؟ یہ پھول ایسے رخسار کس نے چانٹے مار مار کر لال کر دیئے؟ کیا یہ بھی آئینے کا دھوکہ ہے؟"

"میں کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔" آئینے نے کہا۔ "جو کچھ تم ہو جو تم پر گزری ہے۔ وہ سب میرے عکس میں موجود ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کچھ اور بھی۔ کیونکہ میں صرف تمہارا ماضی نہیں ہوں۔ تمہارا مستقبل بھی ہوں۔ اگر غور سے مجھے دیکھو گی تو تمہیں وہ بھی نظر آئے گا۔ جو آگے آنے والا ہے۔ مجھے لوگوں سے بھی شکوہ ہے۔ وہ جو قسمتوں کے پاس جاتے ہیں اور مجھ سے کچھ نہیں پوچھتے۔ اگر وہ دن میں صرف ایک بار مجھے غور سے دیکھ لیا کریں۔ تو انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہ پڑے!"

آگے کیا ہونے والا ہے؟ پھول دتی کی پھٹی پھٹی آنکھیں متوحش نگاہوں سے آئینے کو دیکھنے لگیں۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی چانٹا نہ مارا تھا۔ کبھی بھول کے بھی کوئی کڑوی بات تک نہ کہی تھی۔ ابھی چھ مہینے تو ہماری شادی کو ہوئے ہیں۔ آج سے تین ماہ پہلے تو ہم کشمیر میں تھے۔ ہنی مون منا رہے تھے۔ تمہیں یاد نہیں ہے؟ ہم وہاں کتنے خوش تھے۔

پھول دتی نے غور سے آئینے میں دیکھا۔ اور یکایک کانچ کی سطح اس طرح متلاطم ہو گئی۔ جیسے ہوا کے جھونکے سے چادر آب لہرا جائے۔ سبز ڈھلوان کے ساتھ ساتھ فیروزپوری نالہ بہہ رہا تھا۔ جب پانی ڈھلوان سے بہتا ہے تو چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے پتھر اس کے ساتھ بہتے ہیں۔ پانی پھسلتا ہے تو مچھلیوں کی کمر لچکتی ہے۔ اور کوئی کسی کی لچکتی ہوئی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اور کوئی گھبرا کر پلٹ کر کسی کے سینے سے لگ کر خوشی سے سسکنے لگتا ہے۔ خوشی کے بھی آنسو ہوتے ہیں۔ پھول دتی کے غم کے آنسوؤں میں وہ خوشی کے آنسو چھلک اٹھے۔ ہائے کیسے پیارے دن تھے وہ! ڈھلوان پر اخروٹ

کے درختوں پر چھوٹے چھوٹے سبز اخروٹ لٹک رہے تھے۔ اور سطح زمین پر انجوں کے لاکھوں نیلے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اپنی آنکھیں کھول کر محبت کے دیوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ اک آئینہ حیران ہر سانس محبت کی خوشبو سے لرزاں!

دمکتی ہوئی چاندنی میں پانی کے کنارے بیٹھے بیٹھے جب کوئی ٹراؤٹ مچھلی چمک اٹھتی۔ اور زیر آب پھسلتے ہوئے کہیں چلی جاتی۔ تو پھول دتی حیران ہو کر اپنے آپ سے پوچھتی یہ مچھلی کہاں جا رہی ہے؟ کیا اس دنیا میں کسی کا کوئی محبوب ہے؟ جس کے پاس سب کچھ تج کے نظریں جھکا کے چلا جانا ہوتا ہے۔ ایسا ہی تھا تو وہ اتنے دن اپنے محبوب کے بغیر کیسے رہی؟ کیسی خاموشی سنسان غیر متلاطم زندگی تھی وہ ہاتھوں کے لمس سے بے گانہ آنکھوں کے سوال سے ناآشنا۔ دل کی خلش سے اجنبی۔ پھول دتی کا دل آسودہ جذبات سے لبریز ہو گیا۔ اور اُس نے سوچا اس سے آگے کچھ نہیں ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ اور اس نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا چہرہ اپنے خاوند کے کوٹ میں چھپا لیا۔

اور گردھاری نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ کل ہم لوگ مرگ جائیں گے۔ پھول دتی نے کوٹ کے کالر سے سر اٹھا کر اخروٹ کے درختوں سے پرے گل مرگ کے پہاڑ کو دیکھا۔ گل مرگ کا جنگل چاندنی میں سویا پڑا تھا۔ اور اس سوتے ہوئے جنگل کی چوٹی پر پہاڑ کے پیالے میں گل مرگ تھا۔

گل مرگ کا پیالہ گویا اُن کی خوشبوؤں کا لبریز پیالہ تھا۔ وہ پیالہ نہ تھا۔ محبت کا ہالہ تھا جس نے اُن دونوں روحوں کو اپنے مرکز میں لے لیا تھا۔ جب محبت آتی ہے تو اور کوئی نہیں رہتا۔ کوئی سیاح نہیں رہتا اور کوئی مقام نہیں رہتا۔ کوئی واقف کار نہیں رہتا۔ اور کسی دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ محبت، محبت کرنے والوں کو بالکل اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس دنیا میں رہتے

ہوئے بھی وہ اس دنیا سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری دھرتی گویا صرف اُن دونوں کی ہو جاتی ہے۔ محبت کے لعل پھول صرف ان دونوں کے لئے مہکتے ہیں۔ لوگ بازاروں میں صرف ان کے لئے چلتے ہیں۔ لکڑہارے جنگل میں لکڑیاں، اخروٹ، پھول اور پھل صرف ان کے لئے لاتے ہیں۔ آسمان پر بادل ان کے لئے اڑتے ہیں۔ اور زمین پر وہ اکیلا اجنبی شاعر بگ ڈنڈی پر چلتا ہوا صرف ان کے لئے گیت گاتا ہے! الیتھر کی جھیل پر برف کے تودوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے پھول دتی نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں دور دور اپنا مغرور سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہ چوٹیاں جو تبت کو دیکھتی ہیں۔ بھوٹان کو دیکھتی ہیں سکم کو دیکھتی ہیں لداخ کو دیکھتی ہیں۔ یہ چوٹیاں جو کسی کو نہیں دیکھتی ہیں۔ صرف محبت کے دو متوالوں کو دیکھتی ہیں جو الیتھر کی جھیل کے کنارے برف کے تودوں کے درمیان ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہیں۔ کتنے ہزاروں لاکھوں سال کے بعد یہ لمحہ آیا ہے۔ جب ہر چوٹی کے سنہرے پنے پورے ہوئے ہیں۔ اب ان چوٹیوں کو کسی کا انتظار رہے گا۔

آنے والے آ گئے۔

مگر وقت تھمتا نہیں ہے۔ تھمتا ہوا محسوس ہوتا ہے اسی لئے آنے والے آتے ہیں اور آ کر چلے جاتے ہیں۔ دو تین ماہ ہنی مون کے کتنی جلدی ختم ہو گئے۔

پھول دتی نے مایوس ہو کر دونوں ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لئے اور آئینے کی طرف دیکھ کر حسرت سے پوچھا کہاں گئے وہ دن؟ اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئے؟ وہ محبت اور امیدوں کے جگمگاتے ہوئے دن کہاں چلے گئے اور ان کے جاتے ہی یہ زرد کا چانٹا۔۔۔۔!

پھول دتی نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے پھول سے نازک رخسار پر رکھ لیا۔ جہاں ابھی تک گرد ہاری کے چانٹے کے نشان تھے وہ دن اس لئے ختم ہو گئے کیوں کہ پیسے ختم ہو گئے تھے۔

ہنی مون کے لئے تمہارے باپ کے دیئے ہوئے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ اور گردھاری کی چھٹی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور گرم میدانوں کی کڑی محنت اُسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ آئینے نے جواب دیا۔

چھ مہینوں میں ہی وہ پھر مجھ سے پیسے مانگنے لگے ہیں۔ اپنے باپ سے جاکر پیسے مانگ کر لاؤ۔

تو جاؤ۔

کیا منہ لے کے جاؤں۔ شادی پر اتنا کچھ تو انہوں نے دیا تھا۔ گھر کے بھنڈار بھر دیئے تھے۔

جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ چانٹا کھانا پڑے گا۔

پھول دتی ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ اُس نے آئینے سے منہ موڑ لیا۔

گردھاری کوئی بُرا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک خوش اخلاق، خوش رو، خوش مزاج نوجوان تھا۔ اور ایک چھوٹے سے سرکاری دفتر میں ایک چھوٹا سا سرکاری افسر تھا۔ تنخواہ بھی چھوٹی تھی۔ بس ساڑھے تین سو روپے اور اوپر کی آمدنی بالکل نہ تھی۔ اور گردھاری نوجوان تھا۔ نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جوانی کی ہزاروں آرزوئیں اور اُمنگیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو معصوم ہوتے ہوئے بھی ساڑھے تین سو میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے چھ ماہ ہی میں گردھاری پر ایک ہزار روپیہ قرض ہو گیا۔

اب کیسے قرض ہو گیا اس کی تفصیل تو وہ بتا نہیں سکتا ہے۔ اُسے کوئی بُری لت بھی نہیں تھی۔ دُھت شراب وہ نہیں پیتا تھا بس کبھی کبھی چکھ لیتا تھا۔ جوئے کی بھی اسے عادت نہ تھی۔ یونہی رمی میں پیسہ دو پیسہ پوائنٹ وہ ہار جاتا تھا۔ ریس کا اُسے چسکہ نہ تھا۔ مارنیا کے انجکشن وہ نہیں لیتا تھا کوٹھوں پر وہ نہیں جاتا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا آرام پسند سکون طلب نوجوان تھا۔ جسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ جسے اچھے کپڑوں کا شوق تھا۔ وہ ایک سلیقے سے

سجے ہوئے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ جس کے ڈرائینگ روم میں خوبصورت پردے جھول رہے ہوں۔ اور نازک منقش صراحیوں میں سے نرگسی پھول جھانکتے ہوں اور اس کی بیوی سنہری چوڑیوں سے مزین کلائی بڑھا کر اپنی نازک انگلیوں سے ریڈیو گرام کا سوئچ کھولتی ہو۔

کیسے معصوم خواب تھے اُس کے کتنے ادھورے سپنے جو محض اس لئے پورے نہیں ہوتے تھے کہ اس کی بیوی میکے جاکر اپنے باپ سے روپیہ مانگنے سے احتراز کرتی تھی..... آخر اس میں ہے کیا۔ آخر اس کا لکھ پتی باپ اتنی دولت اپنے سر پر اٹھا کر چتا میں لے جائے گا۔ ہزار دو ہزار روپیہ ہوتا ہی کیا ہے۔ مانگتے ہی اس کا باپ اُسے یوں چٹکی بجاتے دے دے گا۔

مگر یہ جاہل لڑکی ہے کہ مانتی ہی نہیں!

اس لئے چانٹا! دو چار مکے اور گھونسے۔ ایک بار بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنا۔ بھئی انتہائی بری باتیں ہیں۔ مگر کبھی کبھی ضروری بھی ہو جاتی ہیں۔ اور کون میں کسی بُرے کام کے لئے روپیہ مانگ رہا ہوں۔ شراب کے لئے جوئے کے لئے۔ سٹے کے لئے ریس بازی یا رنڈی بازی کے لئے مانگ رہا ہوں۔ جو یہ اس شدت سے میکے جانے سے انکار کر رہی ہے۔ برابر روئے جا رہی ہے۔ کتنی پیاری، مگر کتنی بے وقوف لڑکی ہے!

مگر میکے تو اُسے جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ قرضہ کیسے چکایا جائے گا۔ اور یہ ضروری سامان کیسے آئیگا۔

چند روز کی مَیں مَیں تو تو کے بعد پھول دتی کو اپنے میکے جانا ہی پڑا۔ وہ وہاں پر دو مہینے رہی۔ اس کے باپ نے اُسے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ یہ روپیہ میں آخری بار دے رہا ہوں۔ مجھے لالچی داماد پسند نہیں ہے۔ نہ میں گردھاری کو ایسا سمجھتا تھا۔ تم لوگوں کو ساڑھے تین سو میں گزر کرنا چاہیئے۔

دو ماہ کے بعد جب پھول دتی پانچ ہزار روپیہ لے کے لوٹی تو گردھاری نے اُسے گلے لگا لیا۔

جھوٹ موٹ نہیں اور محض روپے کی خاطر سے نہیں۔ واقعی وہ اپنی بیوی کی طویل غیر حاضری سے اُداس ہو چلا تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے شدید محبت تھی۔ کبھی کبھی اس کی غیر حاضری میں اُس نے یہ بھی سوچا تھا اس نے خواہ مخواہ اپنی بیوی کو میکے بھیجدیا۔ اگر وہ لوگ تھوڑی سی بچت کر لیتے۔ تھوڑا سا اپنا خرچ کم کر دیتے تو ممکن تھا کہ قرضہ اُتر جاتا۔ کئی بار اس نے یوں بھی سوچا۔ اچھا اب کے وہ روپیہ لے آئے۔ آئندہ میں کبھی اپنی بیوی کو پریشان نہیں کروں گا۔ واقعی بُرا لگتا ہے کسی سے روپیہ مانگنا۔ چاہے وہ اپنا سسر ہی کیوں نہ ہو۔

اس واقعے کے بعد دو سال بڑے اچھے گزرے۔ گردھاری نے اپنا قرضہ اُتار دیا۔ اور باقی کے روپے بڑی خوش سلیقگی سے آہستہ آہستہ خرچ کئے کیونکہ اُسے کوئی بُری لت تو نہیں تھی۔ مگر بُری لت نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر پانچ ہزار ہوتے ہی کتنے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ پانچ کے آگے تین صفر اور تھوڑے عرصے کے بعد صفر ہی صفر۔ روپیہ تو شعلہ ہے۔ چند لمحے بھڑک کر روشنی دیتا ہے پھر راکھ ہو جاتا ہے۔ اگر روپیہ ایک درخت ہوتا جو ہر سال پھل دیتا۔ تو پھول دتی اور گردھاری کے گھر کا آنگن کتنا خوش گوار ہوتا؛ مگر جانے ان سائنس دانوں کو کیا ہوا ہے۔ بنجر چاند پر جانے کے لئے راکٹ بناتے ہیں۔ مگر معمولی گھروں میں روپے کے درخت نہیں اگاتے ہیں۔

اور اب تو پھول دتی کی گود میں ایک خوبصورت بچہ بھی کھیلتا تھا۔ گردھاری کو اپنے لڑکے سے بڑا پیار تھا۔ اس نے اُس کی پرورش کے لئے ایک آیا بھی رکھ لی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے بچے میں مگن تھے۔ پھول دتی بڑے سلیقے والی عورت تھی۔ وہ اپنا چھوٹا سا گھر صاف شفاف اور ستھرا رکھتی۔ خود بھی ہر وقت سجی سجائی رہتی۔ اُس کے ڈرائینگ روم میں کہیں کوئی دھبہ نہ نظر آتا تھا۔ ڈرائینگ ٹیبل کا کانچ ہر وقت چمکتا نظر آتا۔ اس کی ساڑھی کبھی میلی نہ ہوتی۔ بال کبھی الجھے نہ ہوتے گلدانوں میں کبھی باسی پھول نہ ہوتے۔ وہ لوگ ہر تیسرے روز پکچر دیکھتے تھے۔ ہر ساتویں روز

مائی لارڈ ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ مائی لارڈ ہوٹل میں ان کی جگہ مخصوص تھی۔ عربی کونے میں نرم نرم گدوں والا بڑا صوفہ۔ ڈھلیا کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان اور احتراماً جھکا ہوا بیرہ۔ زندگی کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے جب کوئی احتراماً جھکتا ہے۔ چاہے چند لمحوں ہی کے لئے جھکے۔ چاہے چند پیسوں ہی کے لئے جھکے۔ مگر یہ لوگ یوں جھکتے کیوں ہیں۔ اور دوسرے لوگ انہیں جھکا کے خوش کیوں ہوتے ہیں۔ ! شاید کسی کتاب میں اس سوال کا جواب نہ مل سکے گا!

دو سال کے بعد گھر میں پھر جھگڑا شروع ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے باتوں میں تلخی آنے لگی۔ وہ پانچ ہزار روپے کب کے خرچ ہو چکے تھے۔ اب پھر قرضہ بڑھنے لگا تھا۔ پھول وتی ہزار سگھڑاپے سے خرچ کرتی۔ مگر قرضہ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ گردھاری یوں تو بے حد شریف بلکہ مثالی خاوند تھا۔ مگر زندگی کی چند آسائشیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بغیر کوئی شریف آدمی کیسے رہ سکتا ہے؟ پھر منّے کا خرچ تھا۔ منّے کی آیا کا خرچ تھا۔ اس پر گردھاری نے گھر کے لئے قسطوں پر ریفریجریٹر خرید لیا تھا۔ ریفریجریٹر کتنے کام کی چیز ہے۔ گرمیوں میں برف کی لگی ہوئی بیر کی بوتل کتنا مزہ دیتی ہے۔ یخ کی طرح ٹھنڈا دودھ کتنا لطف دیتا ہے۔ ریفریجریٹر میں رکھی ہوئی سبزیاں خراب نہیں ہوتیں۔ جب چاہے برف کھایئے۔ جب چاہے آئس کریم بنایئے۔ شربت پیجئے۔ برف کی قاشوں پر وہسکی ڈال کر زندگی کا لطف دوبالا کیجئے۔ گردھاری کو عرصے سے احساس تھا کہ اس کا گھر فریج کے بغیر سُونا سُونا سا ہے۔ اس لئے وہ بیوی کے منع کرنے پر بھی ایک روز فریج قسطوں پر خرید کے لے آیا۔ ریفریجریٹر کے آنے سے پھول وتی کو کچن میں بڑا آرام ملا۔ گھر میں آسائش کا ایک اور کونہ ابھر آیا۔ اور گھر کی خوبصورتی میں ایک اور رنگ کا اضافہ ہوا۔ مگر اب مشکل یہ آن پڑی کہ ہر ماہ تنخواہ میں سے اس کے لئے قسط کٹ جاتی۔ اس کے اوپر منّے اور آیا کا خرچ تھا ہاتھ تنگ ہونے لگا۔ قرضہ بڑھنے لگا۔ ہوتے ہوتے نتیجہ یہ ہوا کہ گردھاری ریفریجریٹر کی چار قسطیں نہ دے سکا۔

ادھر کمپنی والوں کا نوٹس آگیا۔ انہوں نے اب تک اُس پر بہت مہربانی کی تھی۔ مگر اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایک ماہ کے اندر اندر گردھاری نے انہیں گزشتہ چار قسطیں ادا نہ کیں تو کمپنی ریفریجریٹر اٹھا کے لے جائے گی۔

لے جائیں! پھول وتی بڑی نخوت سے بولی۔ ہمیں نہیں چاہیئے۔

واہ! گردھاری فوراً بولا۔ اور یہ جو آٹھ قسطیں میں دے چکا ہوں وہ بے کار میں ضائع ہو جائیں گی۔

تو آٹھ ماہ ہم نے اُسے استعمال بھی تو کیا ہے؟

جب لوگ گھر میں فریج نہیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ ہمیں لوگوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے یہ گھر ہمارا ہے لوگوں کا نہیں ہے۔ پھول وتی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر گردھاری نہ مانا۔ اس پر پھول وتی نے کہا۔

تو گھر کا خرچ کم کر دو۔

کیا کم کر دوں۔ گردھاری گرج کر بولا۔

ہم ہر تیسرے روز سینما جاتے ہیں۔ اب ہفتے میں ایک روز جایا کریں گے۔ پہلے ٹیکسی پر جاتے تھے اب بس میں چلے جائیں گے۔

زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپے بچ جائیں گے۔ اس سے کیا ہوگا۔

مجھے ہر ماہ نئی ساڑھی کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس پہلے کی بہت سی ہیں۔

تم نہیں جانتیں۔ ہر ماہ فیشن بدلتا رہتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ گردھاری کی بیوی ....

آپ کے پاس سوٹ تو بہت ہیں۔ اگر نیا سوٹ نہ سلواتے تو ڈیڑھ سو روپیہ بچ جاتا۔

پھول وتی سہم کر بولی۔

تو کیا ننگا گھوموں؟ گردھاری چیخ کر بولا۔ اک ذرا سی آسائش زندگی میں چاہتا ہوں۔ کوئی عیب نہیں پال رکھا میں نے۔ کوئی برائی مجھ میں نہیں ہے بس ذرا سلیقے سے میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس پر تم میخ نکالتی ہو۔

میں کہاں میخ نکالتی ہوں۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔

دو ہزار سال سے وہی چادر میں پاؤں پھیلانے کی بات میں سن رہا ہوں۔ بھگوان کرے ساری دنیا کی چادریں پھٹ جائیں، تم عورتوں کے پاس اور کوئی بات کہنے کو نہیں ہے؟ جب بات کرتی ہو یہی چادر سامنے لے آتی ہو؟ یہ — چادر نہیں ہے انسان کی ساری اُمیدوں کا کفن ہے۔

پھول دتی چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سر جھکا کے بولی میں الیف۔ اے پاس ہوں۔ کہیں نوکری کرا دو مجھے کسی آفس میں۔

بہت ہوا تو پچھتر روپلی لے آؤ گی ہر مہینے۔ اُس سے کیا ہوگا۔ پھر گھر کون دیکھے گا؟ کیا بات کرتی ہو۔ پھول دتی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ تو پھر یہ طے ہے کہ ریفریجریٹر واپس کر دیا جائے۔ اور گھر کا خرچ کم کر دیا جائے۔

گردھاری نے کہا۔ کچھ کم نہ ہوگا۔ ریفریجریٹر بھی واپس نہیں جائے گا! تمہیں میکے جانا پڑے گا۔

میں نہیں جاؤں گی۔

تمہارے پتاجی اتنے غریب نہیں ہیں کہ تین ہزار روپے نہ دے سکیں۔ اب کے صرف تین ہزار میں کام چل جائے گا۔

آپ کو معلوم نہیں ہے۔ پتاجی کو بزنس میں پچھلے سال دس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ ان

کی مالی حالت بہت پتلی ہے۔ اب وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے!

مراہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ تین ہزار کی رقم ہوتی ہی کیا ہے؟

نہیں۔ میں میکے نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر اب اپنے باپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔

یکایک گردھاری کو غصہ آگیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے زور سے پھول دتی کے ایک لات ماری۔ پھول دتی تیورا کے گر پڑی۔

ایک ماہ کے بعد جب پھول دتی اپنے میکے سے لوٹی تو ہزار روپے اس کے پرس میں تھے۔ مگر اب کے وہ پچھلی مرتبہ کی طرح خوش خوش گھر سے نہ آئی تھی۔ اب کے اس کا رنگ اڑا اڑا تھا۔ اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پتا جی نے اس کی بڑی بے عزتی کی، اسے پورے تو دے دیئے۔ مگر بڑی خوشامد کے بعد دیئے۔ اور اس سے کہہ دیا کہ اب کے اگر وہ روپے کا مطالبہ کرنے آئی تو اسے دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔ پھول دتی رو رو کر کہنے لگی۔ اب وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرا گھر تو یہ ہے اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ تم میرے جیون ساتھی ہو۔ بھگوان کے لئے مجھے میری نظروں میں مت گراؤ۔ گردھاری بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو گلے سے لگا لیا۔ کیسے ظالم لوگ ہیں یہ انہیں اپنی بیٹی سے زیادہ اپنا روپیہ پیارا ہے۔

مگر میں تو اب پرائی ہو چکی۔ میرا ان پر اب حق بھی کیا ہے۔

ہاں! ہاں ٹھیک ہے جانے دو۔ میں تمہیں خود وہاں کبھی نہ بھیجوں گا۔

بات آئی گئی۔ قصہ ختم ہو گیا۔ قرضہ اتر گیا۔ ریفریجریٹر ہمیشہ کے لئے گھر میں آگیا۔ میاں بیوی اور منا گھر میں ہنسی خوشی سے رہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کے قریب پھر مزے میں گزرا۔ میاں بیوی ہر تیسرے روز سینما جاتے۔ ہر ساتویں دن مائی لارڈ میں کھانا کھاتے۔ ہر ماہ نئی ساڑھی آتی۔ منا کے لئے عمدہ سے عمدہ کپڑے۔ مگر اب کے پھول دتی بہت محتاط ہو گئی۔ گھر کا خرچ بہت احتیاط سے کرنے لگی

تھی۔ کبھی کبھی سینما کی کلاس میں کمی کاٹ جاتی۔ کبھی ٹیکسی کے بجائے خاوند کو بس ہی میں لے آتی۔ کسی ماہ اس کا سوٹ کسی ماہ اپنی ساڑھی نہ خریدتی۔ گھر بڑے خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ مگر گرد ہاری کچھ خوش نہیں تھا۔ یوں تو اس کی زندگی میں سب کچھ موجود تھا۔ خوب صورت بیوی۔ پیار کرنیوالی بیوی ایک پیارا بچہ۔ پیارا سا منا سا گھر۔ صاف ستھرا سلیقے سے سجا ہوا۔ ریڈیو گرام ریفریجریٹر.... بس کمی تھی تو صرف ایک کار کی۔ عرصے سے اُس نے ایک چھوٹی سی گاڑی دیکھ رکھی تھی سبک اور سیاہ سیکنڈ ہینڈ اور صرف پانچ ہزار روپے۔ ایسی گاڑی آج کل آٹھ ہزار میں بھی نہ مل سکتی تھی۔ اپنی گاڑی ہو تو خرچ میں کتنی بچت ہو جاتی ہے۔ بس کا کرایہ۔ ٹیکسی کا خرچ کیو پر کھڑے کھڑے جو خون سوکھتا ہے۔ انسان کتنی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ ایک گیلن ڈالو۔ اور تیس میل سفر کر لو۔ بس میں کپڑے جلد میلے ہوتے ہیں۔ گاڑی آجائے گی تو بڑے بڑے افسروں کو گھر بلایا جا سکے گا۔ رات کی دعوت ڈھنگ سے کی جا سکے گی۔ بڑے لوگوں سے ملنے کے لئے مناسب طریقے سے جا سکیں گے۔ گاڑی ہو گی تو ترقی بھی ہو جائے گی۔ انسان کی ترقی کے لئے گاڑی بے حد ضروری چیز ہے۔ انسان محنتی ہو نہ ہو۔ دیانتدار ہو نہ ہو لیکن اگر اس کے پاس ایک گاڑی ہے۔

کئی دنوں سے گرد ہاری پھول وتی کو لکچر پلا رہا تھا۔ پھول وتی سب سمجھ رہی تھی۔ مگر کچھ نہ بولتی تھی۔ آخر ایک دن جب گرد ہاری نے اُسے مارنے کے لئے پھر ہاتھ اٹھایا تو وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

آخر تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں میکے جاؤں۔ اور تمہاری گاڑی کے لئے پانچ ہزار روپے اپنے باپ سے لے آؤں ؟

میرا مطلب یہ ہے گرد ہاری آنا کانی کرتے ہوئے بولا۔ اگر وہ پانچ ہزار قرض دے دیں۔ تو میں آہستہ آہستہ انہیں ادا کر دوں گا۔ گاڑی خریدنے کے بعد تو کوئی بھی اس گاڑی پر قرض دے دے گا۔

مگر گاڑی کو گروی کیوں رکھا جائے۔ آخر میں ان کا داماد ہوں۔ کیا وہ میرے لیے اتنا سا بھی ۔۔۔۔!
پھول وتی بات کاٹ کر بولی۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی میکے چلی جاتی ہوں اور پتا جی سے پیسے لے کے آتی ہوں!

گردھاری کو بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ صدمہ بھی ہوا۔ کچھ مسرت بھی ہوئی۔ بیٹھے بٹھائے مار پیٹ کے بغیر کام بن گیا۔ پھول وتی واقعی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ایسی بیوی کہاں ملے گی؟ سات جنم ڈھونڈنے پر بھی کہیں ایسا جیون ساتھی ملتا ہے؟

پھول وتی کو رخصت ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ گردھاری بہت اداس تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ حالانکہ وہ اُس کے کام سے میکے جاتی تھی۔ مگر جب جاتی تھی گردھاری اداس ہو جاتا تھا۔ آج اتفاق سے موسم بھی ایسا تھا۔ آسمان پر اودے اودے بادل چھائے تھے۔ موسم گلابی، فضا شرابی۔ پھر ہلکا ہلکا ترشح ہونے لگا۔ اور بارش برس کر جو تھمی ہے۔ تو ہوا کے ایسے خوش گوار جھونکے آنے لگے۔ کہ گردھاری کے دل میں بار بار پھول وتی کی تصویر ابھرنے لگی۔ اس وقت وہ یہاں ہوتی تو سمندر کے کنارے گھومنے کو چلتے۔ دوسرے شو کا سینما دیکھتے اور آدھی رات کے وقت محبت میں مخمور جھومتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آتے ۔۔۔۔ آج حالانکہ گھر وہی ہے۔ مگر کس قدر سُونا سُونا سا۔ وہی خوشنما ڈرائینگ روم ہے۔ وہی ریشمی پردے ہیں۔ جھلملاتے ہوئے فانوسوں میں وہی دھیمی دھیمی روشنیاں ہیں۔ مگر پھول وتی کہاں ہے؟ ایک لمحے کے لئے گردھاری کا ضمیر تڑپنے لگا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے اپنے آپ کو بدل دینا چاہیئے۔ آخر ایک کار کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ دنیا میں کروڑوں آدمی ایسے ہیں جو ریفریجریٹر اور گاڑی کے بغیر ایک خوبصورت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور پھول وتی کو اُس کے میکے نہیں بھیجے گا۔ کم از کم روپے کے لئے تو نہیں بھیجے گا۔ آج اس وقت وہ یہاں ہوتی ۔۔۔۔

وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا اور اپنے گہرے دوست شیام سندر سے اپنے دل کا دکھ بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ دونوں دوست وسکی پیتے رہے۔ اور اداس ہوتے گئے۔ کیونکہ موسم ہی ایسا تھا۔ جس میں اداسی بڑی سہانی اور رومانی معلوم ہوتی ہے۔

شیام سندر نے کہا۔ آؤ دوست۔ کہیں باہر چلیں۔

میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ گردھاری نے رنجور ہو کر کہا۔ مجھے اس وقت پھول وتی یاد آرہی ہے۔

میرے ساتھ چلو۔ شیام سندر نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں۔ جہاں تمہارا سارا غم غلط ہو جائے گا۔

کہاں لے چلو گے؟

ارے تم میرے ساتھ چلو تو سہی۔

نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں آج تک کسی ایسی جگہ نہیں گیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے ہائے میری پھول وتی۔

شیام سندر نے رازدارانہ لہجے میں اُس سے کہا۔ ایک لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ اگر اُسے تم ایک نظر دیکھ لو۔ مگر گردھاری نہیں مانا۔ ناچار شیام سندر اکیلا ہی وہاں سے چلا گیا۔ کیونکہ موسم بہت گلابی تھا۔ اور جب شیام سندر چلا گیا تو گردھاری اور بھی اداس ہو گیا۔ اب اسے ہر طرف پھول وتی نظر آنے لگی۔ اور ہر سانس میں اُس کی مہک آنے لگی۔ اور وہ ہر لحظہ رنجور اور اُداس ہوتا گیا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ اس کی اداسی گہری ہو چکی تھی۔ اور اس کی وسکی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب عورت کی آغوش کے سوائے غم غلط کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی اس لئے گردھاری اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح اپنی روح کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت دیر تک وہ شہر کی گلیوں میں اس کے بدنام کوچوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اُسے تلاش تھی ایک ایسی لڑکی کی جو

نئی ہو۔ نسبتاً اجنبی ہو۔ خوب صورت ہو۔ جوان ہو۔ مہربان ہو۔ مزاج کی اچھی ہو۔ طبیعت کی عمدہ ہو۔ شرمیلی ہو۔ گالیاں نہ بکتی ہو۔ سنجیدہ اور مہذب ہو۔ یعنی بیوی بھی ہو۔ اور بازاری بھی ہو۔ عقلمند سے عقلمند مرد بھی ایسے موقعوں پر کتنا بے وقوف ہوتا ہے۔

ایک دلال اُسے دیر تک اِدھر اُدھر گھمائے پھرتا رہا۔ ٹیکسی پر اب تک اُس کے سولہ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اگر آج اُس کی اپنی گاڑی ہوتی تو یہ خرچ تو نہ ہوتا۔ اُس نے پھول وتی کو میکے بھیج دیا۔ گاڑی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گذرتے ہوئے ایک خوب باغیچے سے گھرے ہوئے دو منزلہ مکان کے سامنے رکی۔ دلال نے اُس سے کہا۔ بس صاحب! دنیا میں اس سے بہتر مال کہیں نہیں ہے۔ میں پ کو سورگ کی حد پر لے آیا ہوں، آپ سیدھے اندر چلے جائیے سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی دوسری زل پر چلے جائیے۔ دروازے پر بیل لگی ہے۔ بٹن دبا کر انتظار کیجئے۔ وہ آپ کے لئے انتظار کر ی ہے۔ میں نے سب بندوبست کر دیا ہے۔ صاحب سلام!

گردہاری نے ٹیکسی کو چلتا کر دیا۔ اس نے انتظام کرنے والے کو پانچ روپے کی بخشش دی۔ ں کے بعد وہ پُر امید اور مسرور پرانی وضع کے بنگلے کے باغیچے میں داخل ہو گیا۔ باغیچے میں سے ی اور رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں سرایت کرنے لگی۔ اور وہ جوان ن کے اس پہلے پُر اسرار سفر کے لئے تازہ دم ہوتا گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے پرانے پیتل کے فانوس کو دیکھا۔ سیڑھیوں کے کنارے سے دو رویہ گرائیں تھم کے شاداب پھولوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ واقعی یہ لوگ اچھا ذوق ہیں۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ چوبی تختوں والے برآمدے میں پہنچا تو اس کے دل سے پھول وتی

کا ہر خیال دُور ہو چکا تھا۔ اور اب وہ ہر طرح رات کے انجانے سفر کے لئے تیار ہو چکا تھا۔
اُس نے خوشی سے سیٹی بجاتے ہوئے نئے ارمانوں کو دعوت دی اور جلدی سے دروازے کا
برقی بٹن دبا دیا۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ اور ایک خوب صورت لڑکی مسکراتے ہوئے اس کا استقبا
کرنے کے لئے آگے بڑھی۔

وہ آگے بڑھتے بڑھتے یکایک اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

دروازے پر پھول وتی کھڑی تھی۔

صاحبان صدر کی اقسام

حیدرآباد میں اردو کے مزاح نگاروں اور شاعروں کی پہلی کانفرنس یقیناً ایک جدت ہے اور "زندہ دلانِ حیدرآباد" کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک ثبوت اور دکن کی اردو دوستی کی قدیم روایت میں ایک حسین اضافہ ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت نہیں ہے کہ یہ کانفرنس دکن میں ہو رہی ہے اگر شمالی ہند میں ہوتی تو حیرت ہوتی کیونکہ اس طرف اردو جس دور سے گزر رہی ہے اس میں مزاح کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اہلِ دکن میں ابھی وہ لگن باقی ہے اور آپ کی ریاستی حکومت بھی لائقِ ستائش ہے کہ وہ دکن کی پرانی تاریخ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اردو کے ساتھ انصاف کرتی ہے اور اس کی لو کو تیز کرتی ہے۔ ورنہ دوسری جگہوں پر تو یہ شعلہ سیاہ پوش ہو جاتا ہے۔ اس لگن کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اردو کے مزاحیہ ادب میں دکن کے مزاح نگاروں اور شاعروں نے جو قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں یاد کئے جائیں گے۔ عصمت اللہ بیگ۔

فرحت اللہ بیگ آوارہ اور ناکارہ، ابراہیم جلیس۔ شاہد صدیقی، بھارت چندکہنہ اور یوسف ناظم نریندر لوتھر، رشید قریشی، جیلانی بانو زینت ساجدہ، مجتبیٰ حسین، برق آشیانوی اور اسحاق ایوبی اور دوسرے دوستوں کے کارناموں نے چمنستان اردو میں ظرافت کے جو پھول کھلائے ان کی مہک مدتوں مشامِ جاں کو تازہ کرتی رہے گی۔ اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے بھی میں ان اردو ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے زندہ دلانِ حیدرآباد کو اس کانفرنس کے منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے کیسے اور کیوں مجھے اس کانفرنس کا صدر منتخب کر لیا۔ میں تو بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہوں اور محض جزوی طور پر ایک طنز نگار۔ عرصہ تک یہی سوچتا ہوں کہ اس انتخاب میں مزاح کا کون سا پہلو مضمر ہے۔ یوں تو ہر کانفرنس کا ایک صدر ہوتا ہے اور اس کا ایک خطبۂ صدارت بھی ہوتا ہے جسے وہ خود ہاتھ سے لکھ کر اور کبھی دوسروں سے لکھوا کر سامعین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اکثر ایک ہی خطبۂ صدارت مختلف جگہوں پر نشر کرتے ہوئے اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور آپ کی معصوم مہارت کا ثبوت ..... پہنچاتا رہتا ہے۔ عالم خیال میں بہت سے صاحبانِ صدر کی تصویریں ابھرتی ہیں کیونکہ یہ زمانہ تنوع کا ہے۔ ان دنوں بیماریوں کے نام بڑھے ہیں۔ تو صاحبانِ صدر کی اقسام میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سب سے اچھا صدر ذاتی دبدبہ اور وقار کا مالک ہوتا ہے۔ اور پبلک لائف میں ایک اونچے آدرش کردار کا حامل ہوتا ہے۔ ایسا صاحب صدر تقریباً ہر روز صدارت کرتا ہے اور صرف جمعہ کے جمعہ ناغہ کرتا ہے۔ یہ پیشہ ور اٹھتے بیٹھتے انتہائی بیزاری سے اپنی صدارت کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اجی کیا بتاؤں ابھی ایک خطبۂ صدارت سے فارغ ہوا تھا کہ اب دوسرے کی باری ہے پھر تیسرے کی۔ کل لائنس کلب کے خطبۂ صدارت سے فارغ ہوا تھا تو آج بھیڑ یا کلب کے خطبۂ صدارت کو تیار کرتا ہے۔ پرسوں حیدرآباد

جاتا ہے۔ اور حیدرآباد سے لوٹ کر لکھنؤ جاتا ہے۔ بڑی مصیبت ہے، ہر وقت ہر شخص سے صاحب صدر اپنی ہونے والی صدارت کی ہانک پیٹتے رہتے ہیں۔ عرفِ عام میں ایسے صاحب صدر کو تقریری صدر کہا جاتا ہے۔

پھر ایک۔ دوسری قسم کے صاحب صدر ہوتے ہیں۔ جو گھر میں ہمیشہ اپنی بیوی سے خائف رہتے ہیں۔ لیکن صاحب صدر کی کرسی پر بیٹھتے ہی انتہائی خشونت کے مظاہرے کرنے لگتے ہیں۔ ان کا خطبۂ صدارت جنگ و جدال ہیبت اور جلال، مرجاؤ اور کٹ جاؤ قسم کی اشتعال آمیز تجویزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ صاحب صدر ہر وقت اپنے سامعین کو سر سے کفن باندھ کر کارزارِ حیات میں آگے بڑھنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر خود کو گھر آکر نہایت اطمینان سے اپنی بیوی کی اوڈھنی اپنے منہ پر رکھ کر سو جاتے ہیں۔ یہ شمشیری صدر کہلاتے ہیں۔

پھر ایک اور صدر ہوتے ہیں جو کبھی اور کسی جگہ بھی اور کسی وقت بھی بلائے جا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ایک مائک ہو۔ ایک فوٹو گرافر ہو۔ گلے میں ڈالنے کے لئے ایک ہار ہو اور سننے والا چاہے ایک بھی نہ ہو۔

یہ شرطیں پوری کر دیجئے۔ پھر چاہے آپ اپنے بچے کے ختنہ پر بلا لیجئے۔ یا سر مونڈن پر یہ خود دوڑے دوڑے آئیں گے اور سامعین کی تعداد ان کے صبر کے امکانات کا خیال کئے بغیر سر مونڈن کے موضوع پر ایک ایسی ولولہ انگیز جامع اور جوشیلی تقریر کریں گے کہ بیچارے بچے کی گھگی بندھ جائے گی اور عین ممکن ہے کہ وہ سر منڈھانے سے انکار ہی کر دے اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ بچے کتنے خوش نصیب ہوں گے کہ جن کے سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں یہاں تو سر منڈانے سے پہلے ہی پڑ گئے۔ ایسے صاحب صدر کا چہرہ نورانی اور خطبۂ صدارت شیطان کی آنت کی طرح طول ہوتا ہے۔ اتنی لمبی تقریر جھاڑتے ہیں کہ سامعین کو حبس بے جا کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ بالعموم

ان کو تعزیری صدر کہا جاتا ہے۔

پھر وہ صدر بھی ہوتے ہیں جو اپنے خطبۂ صدارت میں ہر وقت "میں" کی تکرار کرتے ہیں۔ میں نے یہ کیا اور میں نے وہ کیا۔ جب میں وہاں گیا تو یہ ہوا فلاں سنہ میں میں نے پنڈت نہرو سے یہ کہا تھا۔ تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ اور جب، میں یونیسکو میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو تقریر سننے سے پہلے سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ میں ـــ میں ـــ میں ـــ کی اس قدر تکرار ہوتی ہے کہ صاحب پر کسی بکرے یا وزیر ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ایسے لوگ حجت بازی میں طاق ہوتے ہیں اور کسی موضوع کے پابند نہیں ہوتے یوں دیکھئے۔ میں بڑے عالم فاضل معلوم ہوتے ہیں اور پبلک لائف میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ وزیر کے علاوہ یہ لوگ مولوی، پنڈت اور پادری ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انگریزی زبان میں وزیر اور پادری کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

پھر ایک وہ صدر بھی ہوتے ہیں ..... جو صاحب صدر ہونے کے باوجود صدارت کم کرتے ہیں اور ہال میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو زیادہ گھورتے ہیں۔ عرف عام میں ایسے لوگوں کو دل پذیری صدر کہا جاتا ہے۔ ان کا خطبۂ صدارت بھی اصل موضوع سے ہٹ کر طبقہ اناث سے متعلق رہ جاتا ہے

آج کل صاحب صدر کی ایک نئی قسم دستیاب ہونے لگی ہے۔ اور اب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ ان کے چہرے بشرے کو دیکھ کر جلال کی بجائے جمال کا اثر زیادہ واضح ہوتا ہے۔ یہ سامعین پر نگاہ رکھنے کی بجائے اپنے آپ پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کہیں ٹائی نہ ڈھیلی ہو جائے۔ کہیں ساڑھی کا آنچل نہ ڈھلک جائے ان کے عشوے اور انداز کتھک کے ہوتے ہیں۔ خطبہ کسی دوسرے کا لکھا ہوتا ہے عرف عام میں ان کو قلمی یا تصویری صدر کہتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ اپنے کپڑوں اور چہرے کی آرائش اور ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس لئے کچھ لوگ ان کو حریری صدر بھی کہتے ہیں۔

ایک قسم اور بھی یاد آتی ہے۔ بے حد شریف، منکسر المزاج، یہ شمشیری صدر کے الٹ ہوتے ہیں ہمیشہ صلح جوئی اور امن پسندی کی باتیں کرتے ہیں۔ گھر پر بے حد جھگڑالو مانے جاتے ہیں۔ مگر صدارتی کرسی پر بیٹھتے ہی شہد ٹپکانے لگتے ہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کئے جاتے ہیں ان کی تقریر سن کر سامعین کو گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ کوئی خطبۂ صدارت نہیں سن رہے ہیں خمیرہ گاؤزبان چاٹ رہے ہیں۔ یہ خمیری صدر ہیں۔

پھر اساطیری صدر ہیں۔ موضوع کوئی بھی ہو یہ اپنی تقریر کا سلسلہ حوا اور آدم سے شروع کریں گے ماضی پر زیادہ زور دیں گے۔ اور حال کو بدنام کریں گے۔ مستقبل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کی عمر کا اوسط نوے سے سو پر بیٹھتا ہے۔ بیچ بیچ میں شعر پڑھتے جائیں گے۔ اور تاریخ اور مذہب و سائنس کے لمبے چوڑے حوالے دے دے کر سامعین کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ اساطیری صدر کی تقریر ایک بار سن لینے کے بعد آدمی دو ماہ تک کسی کانفرنس میں جانے کی توبہ کر لیتا ہے۔
پھر تحریری صدر ہوتے ہیں جو میری طرح ایک لفظ بول نہیں پاتے اور حرفِ مدعا زبان پر نہیں صفحہ قرطاس پر لانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ پھر وہ صدر ہوتے ہیں جو اس قدر غلط غبی اور غائب دماغ ہوتے ہیں ان کی صدارت ختم ہوتے ہی سے" ہٹ تیری صدر کی" کہنے کو جی چاہتا ہے۔

صاحبانِ صدر کی اور بھی قسمیں ہوں گی مگر وہ اس وقت میرے ذہن سے باہر ہیں یہاں میں نے ان میں سے چند اقسام کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ معلوم نہیں میں کہاں فٹ بیٹھتا ہوں۔ بہرحال صاحب صدر ہونے کی حیثیت سے میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں صدر کے مضحک اور ظریفانہ پہلوؤں سے بھی آپ کو آگاہ کر دوں۔ اور ساتھ ہی آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا جاؤں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

اب چند غیر ضروری باتیں بھی ہو جائیں۔ یعنی اصل موضوع کے بارے میں صاحب صدر

اور سامعین میں بھی تو ایک قدر سے مشترک ہے۔ دونوں اصل موضوع سے گھبراتے ہیں۔ اور جہاں تک موضوع سے اجتناب برتا جائے دونوں بہت خوش رہتے ہیں اس لئے ان کے اصل موضوع کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کر لیں۔ ورنہ کانفرنس کے کارکنان چناں چنیں کریں گے۔

ادب کے بہت سے سنجیدہ اور ثقہ تنقید نگار طنز و مزاح کو بالعموم دوسرے درجہ کا ادب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ غور کیا جائے تو آدمی اگر اشرف المخلوقات ہے تو محض اپنے ہنسنے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ عجب جانور بھی کرتے ہیں۔ فن تعمیر جیسے سے زیادہ اچھا کسی کو نہیں آتا۔ ناچتا مور بھی ہے۔ مکڑی سے باریک اور عمدہ کپڑا کوئی نہیں بناتا۔ بلبل سے زیادہ بہتر کوئی نہیں گاتا۔ چیونٹی سے زیادہ کون عقل مند ہے۔ شیر سے زیادہ دلیر کوئی نہیں۔ مگر ہنستا صرف انسان ہے۔ اور اس لئے وہ صرف..... اشرف المخلوقات ہے اور اشرف المخلوقات سے مراد اس دنیا کی مخلوقات ہے۔

یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ یہاں پر جو فلسفہ غالب ہے اور رائج ہے اس میں تارک الدنیا ہونے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عورتیں گھونگھٹ کاڑھے رہتی ہیں۔ بچوں کے ہنسنے پر پٹائی ہوتی ہے اور ظرافت کو دوسرے درجہ کا بلکہ اکثر اوقات تیندل ادب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ مذہبی کتابیں ہنسنا نہیں سکھاتیں اخلاق اور سماج کے اکثر سانچوں میں ہنسی کا گزر تک نہیں اور جہاں تک ارباب سیاست کا تعلق ہے ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی انسان اس دنیا میں ہنسنا ایک معیوب فعل ہے اور ہنسنا اس سے بھی مشکل کام ہے اس قدر مشکل کہ بسا اوقات اس میں خون تھوکنا پڑتا ہے۔ جب کہیں جا کے ایک لطیفہ مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے آپ دیکھیں گے جو اعلیٰ پیمانے کے ظرافت نگار ہوتے ہیں۔ ان کا سارا کھانا پینا ہنسانے کی کوشش میں صرف ہو جاتا ہے۔ کنھیالال کپور کو دیکھئے، یوسف ناظم کو دیکھئے احمد جمال پاشا کو دیکھئے فکر تونسوی کو دیکھئے نہ دیکھئے میں تو جزوی طور پر طنز نگار ہوں، آپ کو سب کے سب دبلے پتلے نازک اور نستعلیق

سے لگیں گے۔ یہ لوگ اپنے فن کے شہید ہیں۔

ہنسنے اور ہنسانے میں ایک فرق اور بھی ہے۔ ہنسانے سے آدمی دبلا ہوتا ہے۔ اور ہنسنے سے صحت مند ہوتا ہے۔ ہنسنا صحت اور طاقت کی بہترین دوا ہے اور ڈاکٹروں کی بڑی بڑی گرین دواؤں پر بھاری ہے۔ منجملہ دوسرے عوارض کے ہمارے قوم کو ایک عارضہ یہ بھی ہے کہ یہ قوم پچھلے دو ہزار برس سے ہنسی ہی نہیں۔ اس لئے اگر ہم ایک طاقتور اور صحت مند قوم بننا چاہتے ہیں تو ہمیں ہنسنا سیکھنا پڑے گا۔ فی الحال تو ہم رونے والی قوم ہیں۔ کوئی بھی مشکل مسئلہ آن پڑے سب سے پہلے ہمیں بھکاریوں کی طرح رونے کی سوجھتی ہے۔ ملک میں اناج کی قلت ہے۔ آؤ روئیں۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ آؤ روئیں۔ رہنے کو گھر نہیں ہے۔ آؤ روئیں۔ مسائل کا ہمت سے مقابلہ کرنے کی ہمیں عادت نہیں ہے ہم صرف رونا چاہتے ہیں۔ کبھی اپنوں کے آگے۔ بالعموم دوسروں کے سامنے اور ایسے ہاتھ پھیلا کر گھگھیا گھگھیا کر روتے ہیں کہ کوئی ترس کھا کر ہماری تھیلی پر دو پیسے رکھ دے۔ ہم اسے فوراً فارن ایڈ سمجھ کر سویکار کر لیتے ہیں۔ خود دار بننے کے لئے اس قوم کو سب سے پہلے ہنسنا سیکھنا پڑے گا۔

مگر انسان ہنستا کیوں ہے جب تک ہم اس مسئلے کو صاف نہ کر لیں معاملہ آگے نہیں بڑھے گا۔ کیوں کہ انسان کی ہنسی کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے۔ بہت سی وجہیں ہیں۔ کچھ نئی کچھ پرانی۔ اور پرانی وجہوں میں سب سے پرانی وجہ یہ ہے کہ انسان بالعموم دوسروں کی تکلیف پر ہنستا ہے۔ یہ انسان کی ابتدائی دور یعنی اس کے زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے۔

اس کی ایک ادنیٰ ترین مثال کے لئے کیلے کا چھلکا ہے جس پر پھسل کر گرنے والے آدمی پر آج بھی سب ہنستے ہیں۔ اس کی دوسری مثالیں بھی ہیں لوگ قحط سے مرتے ہیں اور ذخیرہ اندوزوں پر ہنستے ہیں۔ گھروں میں رہنے والے فٹ پاتھ پر رہنے والوں پر ہنستے ہیں۔ اور جس کے پاس موٹر ہے پیدل چلنے والوں پر ہنستا ہے۔ یہ نہیں کہ غریب اور مفلس اور نادار لوگ نہیں ہنستے۔ مگر غریب

اور امیر کی ہنسی میں بہت فرق ہے۔ جب غریب ہنستا ہے تو وہ گویا اپنی لنگوٹی پر بھاگ کھیلتا ہے۔ انسان کی ہنسی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی بھی دو طبقوں میں بٹ گئی ہے۔ پھر انسان دوسروں کی مضحک حرکات پر ہنستا ہے اور مضحک حرکات وہ سمجھی جاتی ہیں۔ جو عام انسانوں کے قول و فعل سے الگ ہوتی ہیں اور ان کی محدود زندگی کے تجربات اور روایت سے ہٹی ہوتی ہیں۔ اسی طرح لوگ ترقی پسندوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور محتاط ہو کر روایت کی بوجھل زنجیر سے ہمیشہ بندھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر انسان دوسروں کی خامیوں پر ہنستا ہے۔ خامیوں پر ہنسنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ مگر اپنی خامیوں پر بھی ہنسنا چاہیئے اس سے تزکیہ نفس بھی ہوتا ہے اور دوسروں کو معاف کر دینے کی صلاحیت پیدا ہوتا ہے۔ مگر اپنے یہاں یہ رواج عام ہے کہ ہم دوسروں کی خامیوں پر ہنستے ہیں اور اپنی خامیوں پر پردہ ڈالتے ہیں مگر انسان نے آگے بڑھنا سیکھ لیا ہے اس لئے وہ مزاح برائے مزاح کے قائل نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی اچھی چیز ہے مگر اب تو وہ اس پرانے دور سے آگے نکل آیا ہے۔ اب وہ محض کیلے کے چھلکے پر پھسلے سے نہیں ہنستا۔ اب اس کی ہنسی کی زد میں چھلکے ہیں "یہ سماج" کے اور سیاست کے جن پر وہ پھسل رہا ہے۔ اب وہ تضاد پر ہنستا ہے۔ حالات کے تضاد پر طبقوں کے تضاد پر، سماج کے تضاد پر، سرکار اور اس کے اضافہ کے تضاد پر اس تضاد کی گہری سوجھ بوجھ پر وہ گہرا طنز پیدا ہوتا ہے جو نئے مزاح کی صنعت ہے اور نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب میں مقبول اور معروف و مشہور ہے۔ طنز وہ تیز نشتر ہے جس سے مزاح نگار سماج کے ناسور کے فاسد مادے کو نکالتا ہے اور اسے صحت و طاقت و ترقی کی جانب راغب کرتا ہے۔

پھر ہنسی کی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے یعنی بلا وجہ ہنسنا جیسے عورتیں ہنستی ہیں اور بچے ہنستے ہیں۔ مگر آج کل یہ بہت کم ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے سماج کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس کی

عورتوں اور بچوں نے بلاوجہ ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ عورتیں شاید اس لئے نہیں ہنستیں کہ اب یہ دنیا ان کی تخلیق کی طرح خوبصورت نہیں رہی۔ اور بچے اس لئے نہیں ہنستے کہ انہیں بھی گندم کا بھاؤ معلوم ہو چکا ہے آج کل کی ہنسی رونے سے مشابہ ہے۔ لوگوں کے دل دکھے ہوئے ہیں۔ مگر وہ انسان ہیں اور جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اس لئے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ سینہ سپر ہو کر ظالموں پر ہنسنا شروع کر دیتے کبھی کبھی ہنسی ایک تلوار بھی ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایک سیپ ہے۔ جس کے اندر آنسو کا ایک قطرہ موتی کی طرح چھپا رہتا ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کیا کبھی وہ زمانہ بھی آئے گا۔ جب آدمی کسی دوسرے آدمی کی تکلیف پر ہنسے گا۔ دوسروں کا مال ہتھیا کر نہ ہنسے گا۔ دوسروں پر ظلم کر کے نہیں ہنسے گا۔ جب حالات کا یہ خوفناک تضاد مٹ جائے گا اور انسان اور انسان کی ہنسی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہے۔ جب انسان اپنے اندر سے دل کے اندر سے ہنسنا چاہیں گے۔ کیونکہ وہ سب ایک خوش حال معاشرہ کے خوش حال افراد ہوں گے۔ اس بے ضرر خوشی کے لئے ہوئی ظرافت کے لئے ہم سب جیتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں اس دن کی جس دن انسان بلاوجہ اپنی معصوم ہنسی ہنسے گا۔ اس دن یہ شاید بھگوان بھی ہنسے گا۔ اس دن یہ ساری کائنات ایک لیٹینے کی طرح کھل کر سدا بہار ہو جائے گا۔

چندرو کی دنیا

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا۔ اور باندرے آکر بھی یہی دھندا رہا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں بھی سدھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے نیچے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سوتا تھا، اور باندرے میں بھی وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود پترے کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اسے کراچی سے تھا، نہ اسے بمبئی سے صحیح بات تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ ذہنی لگاؤ کسے کہتے ہیں؟ کلچر کسے کہتے ہیں؟ حب الوطنی کیا ہوتی ہے؟ اور کس بھاؤ بیچی جاتی ہے؟ وہ ان سب نئے دھندوں سے ناواقف تھا۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ جب اس نے آنکھ کھولی، تو اپنے آپ کو سدھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجھتے، جھاڑو دیتے، پانی ڈھوتے، فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔ اسے ان باتوں کا

کبھی ملال نہ ہوا، کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد ہی روٹی ملتی ہے۔ اور اس قسم والے لوگوں کو ایسے ہی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سدھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی اور ہر وقت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے وہ حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی کو بھی روٹی کے ٹکڑے میں لپیٹ کر نگل جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ کون تھے؟ کسی کو پتہ نہ تھا۔ خود چندر دو نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ سدھو حلوائی اسے گالیاں دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ چندر دو کو سڑک پر سے اٹھا کر لایا ہے، اس پر چندر دو نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ نہ سدھو کے لئے شکریئے کے نرم جذبے کا اس کے دل تک گزر ہوا۔ کیونکہ چندر دو کو کوئی دوسری زندگی یاد نہیں تھی۔

اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ سیڑھیوں کے پیچھے سونے والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں سہتے ہیں۔ ایک کام کرتا ہے، دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بس ایسی ہے یہ دنیا اور ایسی ہی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ یعنی ایک وہ جو اوپر والے ہیں۔ دوسرے وہ جو نیچے والے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں۔ اور جو ہے وہ کب کیوں اور کیسے بہتر ہو سکتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کے لئے کبھی کبھی ہوا میں سکہ اچھال کر ٹاس کر لیتا ہے اسی طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لئے ٹاس کر لیا ہوگا اور اسے اس خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چندر دو کو اپنی قسمت سے کوئی شکایت

تھی ہرگز نہیں! وہ ایک خوش باش محنت کرنے والا، بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والا لڑکا تھا۔ وہ رات دن اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتا تھا کہ اسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ مگر بمبئی آکر تو اس کے ہاتھ پاؤں اور کھلے اور بڑھے۔ سینہ پھیلا۔ گندمی رنگ صاف ہونے لگا۔ بالوں میں لچھے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں عزور کسی بڑے گھر کی رہی ہوگی۔ اس کے پھیلے ہوئے سینے۔ باہوں کی مضبوط مچھلیاں اور کھردرے سخت ہاتھ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کا باپ بھی ممکن ہے اسی بڑے خاندان کا کوئی جوان اور تگڑا نوکر رہا ہو گا۔ اس قسم کے تجربے بالعموم سڑک پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گزر تھا کہ وہ سن سکتا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف گونگا تھا بہرا نہ تھا۔ اس لئے حلوائی ایک دفعہ اسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد حلوائی سے کہا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور کیا جا سکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو اپریشن کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش نہیں کی سدھو نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے گا۔ مگر جواب نہ دے سکے گا۔

چندرو کا یہی نقص سدھو کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اسی فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کر دیں۔ اس کے لئے قانون پاس کئے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں اور اخبار نکالے جاتے ہیں پولیس اور فوج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ سُن لو مگر جواب نہ دو۔

اور چندر و تو پیدائشی گونگا تھا۔ یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا بُرا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں، مخصوص حدود کے اندر رہ کر اپنا زاویہ نگاہ رکھتے ہوئے وہ چندر و کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر خوش تھا اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندر و کی پرورش ایک بیٹے کی طرح کی ہے کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا اور بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگاتا ہے۔ جب تک چندر و کا لڑکپن تھا۔ سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندر و لڑکپن کی حدود پھلانگنے لگا تو سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندا شروع کیا۔

حلوائی کی دکان پر تو اس کے اپنے بیٹے بیٹھے تھے۔ اس نے چندر و کے لئے چاٹ بیچنے کا دھندا طے کیا۔ ہولے ہولے اس نے چندر و کو چاٹ بنانے کا فن سکھا دیا۔ جل جیرہ اور کانجی بنانے کا فن۔ گول گپے اور دہی بڑے بنانے کے طریقے۔ چٹخارہ پیدا کرنے والے تیکھے مصالحے۔ کُرکُری پاپڑیاں اور چنے کا لذیذ مرچیلا سالن۔ بھٹورے بنانے اور تلنے کے انداز۔ پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام ـــــ پھر چٹنیاں ـــــ لہسن کی چٹنی۔ لال مرچ کی چٹنی۔ ہرے پودینے کی چٹنی۔ کھٹی چٹنی۔ میٹھی چٹنی۔ ادرک کی چٹنی اور پیاز اور انار دانے کی چٹنی۔

پھر انواع و اقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز دہی بڑے کی چاٹ، کانجی کے بڑے کی چاٹ، میٹھی چٹنی کے پکوڑوں کی چاٹ آلو کی چاٹ، آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ، ہری مونگ کے گول گپے۔ ہر مصالحے کے گول گپے۔

جتنے برسوں میں چندر و نے یہ کام سیکھا، اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم اے پاس کر لیتا ہے پھر بھی بیکار رہتا ہے۔ مگر سدھو کا گھر بے کار گریجویٹوں کو اگلنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندر و اپنے کام میں مشاق ہو گیا ہے اور جوان ہو گیا ہے، تو اس نے چار پہیوں والی

ایک ہاتھ گاڑی خریدی۔ چاٹ کے تھال سجائے اور چندرو کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا۔ ڈیڑھ روپے روز پر۔

جہاں چندرو چاٹ بیچنے لگا وہاں کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔ سدھو نے بہت سوچ سمجھ سے یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھارلنگنگ روڈ پر اور پالی ہل کے چوراہے کے قریب ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے اس نے چاٹ کی چار پہیوں والی گاڑی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بہت بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بنک تھا دوسری طرف ٹیلی فون ایکس چینج، تیسری طرف ایرانی کی دکان، چوتھی طرف کھوڑ بندر روڈ کا ناکہ۔ بیچ میں شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش لباس نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم بہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ ہمیشہ تازہ اور عمدہ ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ ہات صاف اور تول پورا۔ گاہک کو چاہیئے ؟ چندرو کی چاٹ اس نو آبادی میں چاروں طرف مقبول ہوتی گئی۔ اور شام کے وقت اس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپے روز پر لگایا تھا۔ اور چندرو جو ڈیڑھ روپے میں خوش تھا، اب تین روپے یومیہ پاکر بھی خوش تھا۔ کیونکہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ اسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا۔ اور اپنے کام سے اسے لگن تھی۔ وہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا تھا اور انہیں خوش کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ شام کے چار بجے وہ چاٹ گاڑی لے کر ناکے پر آجاتا۔ چار سے آٹھ بجے تک رو کے بغیر آرام کا سانس لئے بغیر وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلہ خالی ہو جاتا اور وہ اسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آتا۔ کھانا کھا کے سینما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سینما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھا کر سیڑھیوں کے نیچے سو جاتا۔ اور صبح پھر اپنے

کام پر۔

یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ بے فکرا در زندہ دل تھا۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن، نہ بچے نہ بیوی۔ دوسرے لوگوں کے لئے بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی خانہ تھا۔ دوسرے لوگ بہت سے لوگوں کے بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر چندر دا ایک ہی لکڑی کا تھا اور لکڑی کے ایک ہی ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا۔

سانولی پاروکو اسے پریشان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بالے جھلاتی پاؤں میں چھوٹی سی پازیب کھنکھناتی جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلہ کے گرد کھڑی ہو جاتی تو چندر دا سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ وہ بڑے کی پتیل تقریباً چاٹ کر ذرا سا وہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتا اور پھر اسے دکھا کر کہتا۔

"ابے گونگے! تو بہرہ بھی ہے کیا! میں نے دہی بڑے نہیں مانگے تھے۔ دہی پٹاکری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا۔ تیرا باپ؟"

اتنا کہہ کر وہ اس بڑے کی تقریباً خالی پتیل کو اسے دکھا کر بڑی حقارت سے زمین پر پھینک دیتی ——

وہ جلدی جلدی اس کے لئے دہی پٹاکری بنانے لگتا۔ پارو اس پٹاکری کی پتیل صاف کر کے اس میں آدھی پٹاکری چھوڑ دیتی اور غصے سے کہتی۔

"اتنی مرچ ڈال دی!—— اتنی مرچ!!—— چاٹ بنانا نہیں آتا تو ٹھیلہ لے کر ادھر کیوں آتا ہے؟—— ابے اپنی پٹاکری واپس لے لے!"

اتنا کہہ کر وہ دہی اور مٹی کی پٹاکری اپنے نانن کے گود میں پھنسا کر اس کے مٹیلے پر گھمانی کبھی اسے جھوٹی پٹاکریوں کے تھال میں واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی اس کی سہیلیاں ہنستیں۔ تالیاں بجائیں۔ چیندر دونوں ہاتھوں سے ناں ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے اپنی جھوٹی پٹاکری زمین پر پھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

"اچھا سمجھ گئی، تیرے چنوں کے تھال میں ڈال دوں!" وہ جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی۔ جلدی جلدی گھبرائے ہوئے انداز میں چیندر زور زور سے سر ہلاتا۔ پھر زمین کیطرف اشارہ کرتا۔ پارو کھلکھلا کر کہتی۔

اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟" پارو نیچے زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا لیتی۔

اس پر چیندر اور بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا کر منع کرتا۔ بالآخر پارو اسے دھمکاتی "تو جلدی سے آلو کی چھ ٹکیاں تل دے، اور خوب گرم گرم مصالحے والے چنے دینا اور ادرک بھی، نہیں تو یہ پٹاکری ابھی جائے گی تیرے کالے گلاب جامنوں کے برتن میں!"

چیندر خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دیتا۔ ماتھے پر آئی ہوئی ایک گھنگھریالی لٹ پیچھے کو ہٹا کے تولئے سے ہاتھ پونچھ کر جلدی سے پارو اور اس کی سہیلیوں کے لئے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف ہو جاتا۔

پھر کبھی کبھی پارو حساب میں بھی گھپلا کیا کرتی۔

"ساٹھ پیسے کی ٹکیاں، تیس پیسے کی پٹاکری۔ دہی بڑے تو میں نے مانگے ہی نہ تھے۔ اس کے پیسے کیوں ملیں گے تجھے؟ ہو گئے نوّے پیسے دس پیسے کل کے باقی ہیں.... لے ایک روپیہ!" گونگا چیندر پیسے لینے سے انکار کرتا۔ وہ کبھی کبھی پارو کی شوخ چمکتی ہوئی شریر آنکھوں

دیکھتا۔ کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں کپکپاتے ایک روپے کے نوٹ کو دیکھتا اور سر ہلا کر انکار دیتا اور حساب سمجھانے بیٹھتا وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا۔ جب وہ پارو کو حساب سمجھاتا تھا۔ ی بڑے کے تھال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی کو اپنے منہ میں رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا تے ہوئے گویا اس سے کہتا۔

"دہی بڑے کھا تو گئی ہو، اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی؟"

"تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ!" وہ اپنے گلے میں سے تیس پیسے نکال پارو کو دکھاتا۔

اس پر فوراً چمک کر کہتی۔ "اچھا تیس پیسے مجھے واپس دے رہے ہو! - لاؤ!"

اس پر چندرو فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا۔ "نہیں!"

انکار سے وہ سر ہلا کر پارو کو سمجھاتا۔

"مجھے نہیں تمہیں دینا ہوں گے یہ تیس پیسے!" وہ اپنی تہدیدی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے رہ کر کے کہتا۔ اس پر فوراً پارو اسے ٹوک دیتی۔

"ابے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ۔ ! نہیں تو ماروں گی چپل!"

اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لاجواب ہو کر بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش دں سے پارو کی طرف دیکھنے لگتا کہ پارو کو اس پر رحم آجاتا۔ جیب سے پورے پیسے نکال کر دے دیتی اور بولتی۔

"تو بہت گپلا کرتا ہے حساب میں۔ کل سے تیرے ٹھلے پر نہیں آؤں گی!"

مگر دوسرے دن وہ پھر آجاتی تھی۔ اسے چندرو کو چھیڑنے میں مزا آتا۔ اور اب چندرو کو بھی آنے لگا تھا۔ جس دن وہ نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اس دن بھی اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی نہیں پڑتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا تھا۔

جہاں پر اس کا ٹھیلہ رکھا تھا، وہ اس کے سامنے کی گلی سے آتی تھی۔ پہلے پہل چندرو ٹھیلہ بالکل یونین بینک کے سامنے ناکہ پر تھا۔ ہولے ہولے چندرو اپنے ٹھیلے کو کھسکاتے کھسکاتے پارو کی گلی کے بالکل سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ سکتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے ٹھیلہ یہاں لگایا تھا تو پارو ٹھیلے کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ کر کچھ چونکی تھی، کچھ غصہ بھڑک گئی تھی۔

"ارے تو ناکے سے ادھر کیوں آگیا ہے گونگے؟"

گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں وہ اب تک ٹھیلہ لگاتا آرہا تھا۔ ادھر کیبل بچھانے کے لئے زمین کھودی جا رہی تھی اور بہت سے کالے پائپ رکھے ہوئے تھے۔

وجہ معقول تھی۔ پارو لاجواب ہوگئی۔ پھر کچھ نہیں بولی۔ لیکن پھر جب کیبل بچھ گئے اور زمین کی مٹی ہموار کر دی گئی تو بھی چندرو نے اپنا ٹھیلہ نہیں ہٹایا۔ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولی۔ ہاں اس کی چنچل سبھاؤ میں ایک عجیب سی تیزی سی آگئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ ستانے لگی۔

پارو کی دیکھا دیکھی اس کی دوسری سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں۔ اور کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی۔ مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا اور وہ جلدی سے بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز آکر انہیں بھی ڈانٹ بتائی تو پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اگلے چار روز تک چندرو کو ستانا بند کر دیا۔ اس پر چندرو کو ایسا لگا کہ آسمان اس پر ڈھے پڑا ہے یا اس کے پیروں تلے زمین پھوٹ گئی ہو۔ یہ پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اس نے چاہا کہ اسے ڈانٹ پلائے لیکن جب اس پر بھی پارو کے انداز نہ بدلے اور وہ ایک مہذب متمدن لیکن چاٹ بیچنے والے چندرو ایسے چھوکروں کو فاصلے پر ر

والی لڑکی کی طرح اس سے چاٹ کھاتی رہی تو چندر دا اپنی گونگی حماقتوں پر بہت نادم ہوا۔

ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود حساب میں گھپلا کر دیا۔ سوا روپیہ بنتا تھا، اس نے پونے دو روپے طلب کئے جان بوجھ کر خوب لڑائی ہوئی جم کے لڑائی ہوئی بلآخر چندر دو نے اپنی غلطی تسلیم کر لی، اور یہ گویا ایک طرح پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی

چندر دو بہت خوش ہوا۔ کیونکہ پارو اور اس کی سہیلیاں اسے پھر ستانے لگی تھیں۔

بس اسے اتنا کچھ ہی چاہیئے۔ ایک پازیب کی کھنک اور شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح اس کی گونگی سنسان دنیا کے ویرانے کو ایک لمحہ کے لئے روشن کر دے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے قدموں میں گڈمڈ ہو کے چلے جاتے، وہ اس کی پازیب کی کھنک کو دوسری پازیبوں کی کھنک سے الگ کر کے سن سکتا تھا۔ کیونکہ دوسری لڑکیاں بھی چاندی کی پازیبیں پہنتی تھیں۔ مگر پارو کی پازیب کی موسیقی ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں۔ اس کے دل کی تنہا تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ اور وہ اسی میں خوش تھا۔

اچانک مصیبت نازل ہوئی ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت میں، کیا ٹھیلہ تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا چاروں طرف چمکتا ہوا کانچ لگا تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں، چاروں طرف لال پیلے، اودے اور نیلے رنگ کے کانچ تھے۔ گیس کے دو ہنڈے تھے جن سے یہ ٹھیلہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ پیتل کی جگہ چمکتی ہوئی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ اور ایک صاف ستھری نیپ کن بھی پیش کرتا تھا اور پانی بھی پلاتا تھا۔ چاٹ والے کے گھڑے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی لپٹا ہوا تھا۔ اور ایک چھوٹا ہار چاٹ والے نے اپنی کلائی پر باندھ رکھا تھا اور جب وہ مصالحہ دار پانی میں گول گپے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر گاہک کی طرف سرکاتا تو چاٹ کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے نتھنوں میں

موگرے کی مہک بھی شامل ہو جاتی اور گاہک مسکرا کر نئے چاٹ والے سے گویا ٹمنے کی طرح اس پلیٹ کو حاصل کر لیتا۔

اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے دیکھ کر پُر نخوت آواز میں زور سے کہتا۔

"چکھیئے۔!"

ایک ایک دو دو کر کے چندر و کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع ہونے لگے، تو بھی چندرو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر آجائیں گے۔ یہ اونچی دکان پھیکے پکوان والے کب تک چندرو کی سچی اصلی اور صحیح مصالحوں میں رچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کرائیں گے ہم بھی دیکھ لیں گے۔ اس نے دو ایک گاہک کو نئے چاٹ والے کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سروس کے باوجود انہیں نئے چاٹ والے کی چاٹ، زیادہ پسند نہیں آرہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اپنے کام میں جُت گیا۔ یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی ایک کھنک سنائی دی، اس کا دل زور زور سے دھڑک گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکاتی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی۔ جیسے چڑیاں چہکیں ایسے وہ لڑکیاں بول رہی تھیں۔ کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں۔ فضا میں ابابیلوں کی طرح تیرتی ہوئی سڑک پار کر کے وہ اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں۔

اچانک پارو کی نگاہ نئے ٹھیلے والے کی طرف اٹھی۔

وہ رک گئی۔

اس کی سہیلیاں بھی رک گئیں۔

وہ سانس لئے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا۔

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندر کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے منہ پھیر لیا، اور ایک ادائے خاص سے مڑکر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئی۔

"تم بھی ؟ — تم بھی ؟ — پارو تم بھی ؟"

چندر کا چہرہ غصہ و شرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا۔ جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا۔ جو اس کی روح کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا — "تم بھی ! — تم بھی ! — پارو ! — تم بھی ! ؟" مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔ اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سُن رہے تھے۔ اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویائی کی آخری کوشش گویا کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی اور وہ سر جھکا کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی۔ پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع و اقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں ان سب میں پارو کی آواز سب سے اُونچی تھی۔

ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے ! کیسے برابر کے مصالحے ہیں ! — اس موئے (نام نہ لے کر محض اشارہ کر کے) پرانے ٹھیلے والے کو تو چاٹ بنانے والے کی تو تمیز ہی نہیں۔

"اب تک جھوٹی پتلوں میں چاٹ کھلاتا رہا ہے !"

"ارے اس کے ہاتھ کو دیکھو —" پارو نے جھک کر چندر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسے گندے اور غلیظ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں — !

"ایک نیپ کن تو ہے نہیں اس کے پاس !۔ جب ہاتھ پونچھنے کے لئے مانگو، وہ ہی اپنا

...... گندہ میلا تولیہ آگے کر دیتا ہے "

"اُونہہ!" پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے ہیں۔" میں تو کبھی اس چاٹ والے کے ٹھیلے پر تھوکوں بھی نا۔!"

اس کے آگے چندر و کچھ سن نہ سکا۔ ایک لال آندھی اس کی آنکھوں میں چھا گئی۔ وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے نئے ٹھیلے والے کو جا لیا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندر و نئے ٹھیلے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندر و ایک وحشی کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلہ مع اپنے ساز و سامان کے سڑک پر اوندھا دیا۔ پھر سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ قید کی سزا دی۔ اور پانسو روپے جرمانہ۔ اور جرمانہ نہ دینے پر چار ماہ قید بامشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جرمانہ ادا کرتا؟

چندر و نے پورے چھ ماہ قید کاٹی۔

جیل کاٹ کر چندر و پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔ کوئی دوسرا اس کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ سدھو حلوائی پہلے تو اُسے دیر تک گالیاں دیتا رہا اور اس کی حماقت پر اسے بے نقط سناتا رہا۔ اور دیر تک چندر و سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اگر وہ گونگا بھی نہ ہوتا تو کس سے

کیا کہنا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی، تو اس نے اسے پھر کام پر لگا لیا۔ آخر کیا کرتا۔؟ چندر دبے حد ایمان دار محنتی اور اپنے کام میں مشاق تھا۔ اب جیل کاٹ کر آیا ہے تو تھوڑی عقل بھی آگئی کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے دو تین دن بعد پھر سے چندر دو کو اسی اڈے پر ٹھیلہ دے کر روانہ کر دیا۔

چندر دو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ اس نے چندر دو کے ٹھیلے پر نیا رنگ و روغن کروایا۔ کانچ بھی لگا دیا تھا۔ تپلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیتے تھے۔

چندر دو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلے کر روانہ ہوا۔ آٹھویں دسویں سڑک پار کر کے لنگنگ روڈ کے نالے پر آیا۔ یونین بنک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکس چینج کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا، جہاں پہلے اس کا ٹھیلہ تھا، اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہی چھوکرا ہے، وہی ٹھیلہ والا ہے اس ٹھیلے والے نے چندر دو کو گھور کر دیکھا۔ چندر دو نے اپنی نظریں چرا لیں۔ اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلے پر ایکس چینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلہ روک دیا اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔

چار بج گئے، پانچ بج گئے، چھ بج گئے، کوئی گاہک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔ دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے۔ اور اسے جانتے نہیں تھے چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیئے۔ افسردہ دل چندر دو سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تولیہ لے کر کانچ چمکاتا۔ ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مصالحہ دار پانی کو ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا۔ ہوے ہوے آلو کے بھرتے میں مٹر کے دانے اور مصالحے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سنائی دی دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا۔ پازیب کی کھنک اب سڑک پر آگئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن کو اوپر اٹھایا اور جب دیکھا تو اس کی آنکھیں پارو پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ سے ڈوئی گر گئی۔ اور تولیہ اس کے کاندھے سے اتر کر نیچے بالٹی میں بھیگ گیا اور ایک کاہک نے قریب آکر کہا۔

"مجھے دو سیر سے دو!"

مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے، جتنے احساس تھے۔ جتنے جذبات تھے سب کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آگئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلہ تھا۔ وہ چند قدم پر دوسرا ٹھیلہ تھا۔ اور وہ تکے جا رہا تھا۔ پارو کدھر جائیگی۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوتے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے ان دونوں ٹھیلوں کے قریب آرہی تھیں۔ زیر لب بحث دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

یکایک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے سڑک پار کر کے نئے ٹھیلے والے کو گھیر لیا۔ مگر چند رو کی نگاہیں نئے ٹھیلے کی طرف نہیں پھریں۔ وہ اس خلا میں دیکھ رہا تھا۔ گلی اور سڑک کے سنگم پر جہاں آج چھ ماہ بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیا و مافیہا، گرد و پیش سے بے خبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔

وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف خلا میں دیکھ رہا تھا۔

یکایک بڑی تیزی سے اکیلی پاروا پنی سہیلیوں سے کٹ کر اس ٹھیلہ پر آ گئی اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اسی لمحے گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ آنسو نہیں تھے، الفاظ تھے.... شکر لینے کے ـــ دفتر تھے شکایتوں کے ـــ اُبلتے ہوئے آنسو.... فصیح اور بلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آ رہے تھے اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی۔

آج پارو گونگی تھی۔ اور چندر و بول رہا تھا۔ ارے وہ کیسے کہے۔ اس پگلے سے کہ پارو نے بھی تو چھ ماہ انہی آنسوؤں کا.... انہی آنسوؤں کا انتظار کیا تھا۔!

جہاں ہوا نہ تھی

ہم ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے سورج کی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی وادی کو دیکھ رہے تھے۔ میرا ہات اُسکے ہات میں تھا اور اس کا سر میرے کندھے پر تھا۔ اور میرے دل میں ایک بلبل تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک نغمہ تھا۔ اور میں نے اس سے پوچھا۔

"ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"میرے خوابوں کے جھولے میں!"

"اسے جھولے سے باہر لے آؤ۔ اُسے یہاں کھیلنے دو۔ دیکھو یہاں گھاس کتنی ہری ہے۔ پھول کتنے شگفتہ ہیں۔ خوبانی کے پھول کتنے سنہرے ہیں!"

"ہاں یہ کنج بہت خوب صورت ہے!" میری محبوبہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گھاس ہری ہے، پھول شگفتہ ہیں۔ تھل سنہری ہیں مگر ہوا نہیں ہے!"

"ہاں۔" میں نے قدرے افسردگی سے کہا۔ "یہاں ہوا نہیں ہے!" "اور بچہ ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" وہ بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اور یہاں کوئی اور بچہ نہیں ہے جس سے وہ کھیل سکے!"

"ہاں!" میں نے خوب صورت لیکن سنسان وادی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ارے تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں تو کوئی دوسرا بچہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا بچہ کس کے ساتھ کھیلے گا؟"

چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا۔ سنسان وادی میں جیسے دھوپ کی خوشگوار لہریں اٹھ رہی ہوں۔ جیسے گھاس نے ان پر اپنا بچھونا بنا دیا ہو۔ اور سو گئی ہو۔ درختوں کے پتے بھی جیسے ایک دوسرے کی باہنہ پر سر ٹیکے اونگھ رہے ہوں۔ دھوپ، آرام، غنودگی، میں نے دھیرے سے اپنی محبوب کو کھینچ کر لپٹا لیا۔ اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا دیئے۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اور وقت اور زندگی اور جنم کے سارے فاصلے مٹ گئے۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ دل کی دھڑکنے کی صدا بھی نہ آتی تھی۔ صرف کبھی کبھی میری پلکیں اس کی دراز پلکوں سے الجھ کر کانپنے لگتی تھیں۔

صدیوں کے بعد ہم جاگے۔ اور میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ "ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

"وہ میلے میں گیا ہے؟"

"کہاں گیا ہے؟"

اس نے پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ وہاں گیا ہے۔ جہاں کی چوٹی سب سے اونچی ہے جس پر برف پڑی ہے۔ جہاں بادل ہیں اور بچوں کا میلہ ہے۔

"کیا سب بچے وہاں گئے ہیں!"

"ہاں۔"

"وہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ لوگ ہوا کو بلانے گئے ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں سب کچھ ہے۔ مگر ہوا نہیں ہے!" میں نے افسردگی سے سر ہلاکے کہا۔ اور اس کا ہات زد سے پکڑ کر پوچھا "کیا ہوا یہاں کبھی آئے گی۔؟"

"کہہ نہیں سکتی۔" میری محبوبہ سنجیدہ رو ہو کر بولی۔ اور اپنے بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی "کبھی کبھی اس وادی میں ہوا آتی ہے۔ اور ساری وادی برف کے گالوں سے پٹ جاتی ہے۔ درختوں کے پتے گر جاتے ہیں اور بچوں کے ننگے پاؤں پھٹ کر خون سے رسنے لگتے ہیں اور وہ کسی تاریک کھوہ میں پناہ لیتے ہوئے برفیلے بے رحم طوفان کی گرج سن کر سہم جاتے ہیں۔

"نہیں۔ میں اُس ہوا کی بات نہیں کرتا۔"

"تو جس ہوا کی تم بات کرتے ہو۔" میری محبوبہ اپنا ہات مجھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔ وہ بھی یہاں کبھی کبھی آتی ہے۔ اور ہماری وادی گرم ریت سے بھر جاتی ہے۔ اور ہری ہری گھاس کی ساری جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔ اور پانی لاوے کی طرح کھولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور بچوں کی زبانیں لٹک کر باہر آجاتی ہیں۔ اور وہ ٹھنڈے پانی کی ایک بوند کے لئے ہانپتے ہوئے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دھرتی کا سینہ کریدنے لگتے ہیں!"

"نہیں۔ میں اس ہوا کی بات بھی نہیں کرتا۔"

"تو تم جس ہوا کی بات کرتے ہو۔ اُسے لانے کے لئے ہی تو بچے افق پر گئے ہیں۔"

"کیا ہوا آئے گی؟" میں نے محبوبہ سے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں سے پوچھا۔ اس کے بالوں سے

پوچھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے سے پوچھا۔ اور جو جواب مجھے ملا۔ اسے سن کر میں خوفزدہ ہوگیا۔ خاموش ہوگیا۔

"تم بھی ڈر گئے؟" اس نے میرا ہات پکڑ کر کہا۔

"ہاں!"

"اس وادی میں ہر شخص خوفزدہ ہے۔ وہ ہوا آئے گی یا کوئی دوسری ہوا آجائے گی؟"

"کوئی دوسری ہوا؟"

"ہاں" میری محبوبہ بولی۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں۔ اب کے جو ہوا آئے گی۔ وہ سب سے تنداور وحشی اور ظالم ہوگی اور وہ ہوا نہ ہوگی جسے بچے لانے کے لئے گئے ہیں۔ وہ ہوا وادی کا سینہ چیر کے رکھ دے گی۔ اس کے پہاڑوں کو سرمہ بنا دے گی۔ جہاں درخت ہیں وہاں جلتی ہوئی چٹانیں ہوں گی۔ جہاں انسان ہیں وہاں چٹختی ہوئی ہڈیاں ہوں گی!"

"اور میں تمہیں چوم نہ سکوں گا؟ اور تمہارے بالوں سے کھیل نہ سکوں گی۔ اور نہ تمہاری آنکھوں میں اپنے سپنے دیکھ سکوں گی۔

"نہیں..... اور میں بھی اس طرح تمہارے شانے سے لگ کر سکھ کا سانس نہ لے سکوں گی!"

میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے تکلیف دہ لہجے میں کہا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں ہوا نہیں ہے! میں بھی ہوں۔ تم بھی ہو۔ پھول بھی ہیں۔ گھاس بھی ہے۔ خوبانی کے پھل بھی ہیں۔ مگر ہوا نہیں ہے....."

ہم دونوں چپ رہے۔ دیر تک ایک بے نام سی گونج ہمارے دماغ میں بھنبھناتی رہی۔ یکایک وہ گھبرا کر بولی۔ "میرا بچہ! میرا بچہ!!"

"کیا آ گیا؟"

"نہیں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیا پہلے دکھائی دیتا تھا؟"

"ہاں۔ مگر اب وہ دکھائی نہیں دیتا۔ اب تو مجھے وہ چوٹی بھی دکھائی نہیں دیتی!" وہ گھبرا کے بولی۔ اور اس کی نیلوفری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

میں نے اس کا ہات پکڑ کر کہا۔ "یہ ٹیلہ بہت چھوٹا ہے۔ یہاں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ آؤ اس دوسرے بڑے اور اونچے ٹیلے پر چلیں۔ شاید وہاں سے تمہیں بچہ نظر آ جائے گا!"

"گھبراؤ نہیں۔ ہمارا بچہ وہاں اکیلا نہیں ہے۔ اس میلے میں اور بہت سے بچے ہوں گے ہمارے خوابوں کے بچے بڑے بہادر ہیں۔!"

مگر میری محبوبہ کو میری باتوں کا اعتبار نہ تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اور دھیرے دھیرے سسک سسک کر رونے لگی۔

یکایک میں نے چوٹی پر کچھ دیکھا۔ اور میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔ "دیکھو..... دیکھو!" اکدم چونک کر اور سر اٹھا کر جو میری محبوبہ نے چوٹی کی طرف دیکھا تو اس کی آنسو بھری آنکھوں میں مسرت کی چمک آ گئی۔

"دیکھو دیکھو!" میں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "وہ سات رنگوں والی قوس قزح!" وہ خوشی سے بولی۔ "یہ سات رنگوں والی قوس قزح نہیں ہے۔ یہ ہمارے بچوں کا جھنڈا ہے —!"

"اور یہ شور تم سنتی ہو۔ جو بادلوں کے پیچھے چوٹی سے آ رہا ہے؟"

"یہ شور نہیں ہے۔" وہ خوشی سے بولی۔ "یہ ہمارے بچوں کا گیت ہے!"

"کیا وہ ہوائے کرآئیں گے ؟ میں نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ہم دونوں چوٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ اور ایک دوسرے کے
ہاتھ میں ہات دے کر اس وادی میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ جہاں ہوا نہ تھی!

مچھلی جال

گاؤں سویا ہوا تھا۔ بھورے بھورے مچھلی جال دھوپ میں سوکھنے کے لئے لکڑی کی اونچی کھپچیوں پر تنے ہوئے تھے اور ان کی شطرنجی سائے میں بڈھے ماہی گیر سو رہے تھے۔ ساحل کی ریت میں آدھے سے زیادہ اندر دھنسا ہوا سفید شوالہ اپنے کلس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اونچے ٹیلے پر ناریل کا درخت تھا۔ جہاں ایک گدھا چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس سے پرے باڑھ تھی۔ جس کے اندر ناریل کا جھنڈ تھا۔ جو دور تک اندر گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اور جس نے ماہی گیروں کے چھپروں کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

یہاں ساحل کے کنارے کی ریت کس قدر خنک اور نرم تھی۔ ساحل سے جتنا دور جاؤ۔ ریت گرم اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ اور ٹیلوں کے کنارے جہاں سمندری جھاگ سوکھ گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی مہین سیپوں اور سنکھوں کی قطار لگی ہوئی تھی وہاں کی ریت پر پاؤں رکھنے سے پہلے

کانچ کے ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اور پاؤں اک عجیب گدگدا دینے والی کرکری لذت سے آشنا ہوتے تھے۔ گل دیر تک ان ٹیلوں کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ اور اس لذت کے مزا لیتا رہا۔ اور بے فکری سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اور چلتے چلتے بیچ میں رک رک کر خوب صورت سیپیاں گھونگھے اور سنکھ جمع کرتا رہا۔ ساحل ایک نیم دائرے کی صورت میں بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نیم دائرے کے سرے پر یہ گاؤں تھا۔ دوسرے سرے پر اس کا اپنا گاؤں۔ بیچ میں یہ لمبا کٹا پھٹا ساحل تھا۔ اونچے اونچے ٹیلوں سے بھرا ہوا گل چلتے چلتے یکایک ٹھٹک گیا۔ ایک بڑے ٹیلے کی اوٹ میں اک کشتی اوندھے منہ پڑی تھی اور اس کے قریب ایک لڑکی اوندھے منہ لیٹی تھی۔ گل نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے اس لڑکی کے ننھے ننھے پاؤں سرخ مہندی میں رچے ہوئے دیکھے۔ اس کے سیاہ ابرق کی طرح چمکتے ہوئے جوڑے میں گل شفق کا ایک بہت بڑا پھول دیکھا۔ جس کی رنگت بالکل سونے کی طرح تھی۔ ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے تھا۔ دوسرا ہاتھ ساحل کی ریت پر پڑا تھا۔ گل نے اس ہاتھ کی چوڑیاں گنیں۔ گہرے سرخ کانچ کی سات چوڑیاں تھیں۔ لیکن اب کے اسے یہ ہاتھ بہت خوب صورت معلوم ہوا۔ اس نے یہ ہاتھ دیکھا۔ رخساروں پر سوئی ہوئی پلکوں کی آراستہ صف کو دیکھا۔ ان ننھے ننھے نتھنوں کو دیکھا۔ جو سانس کی لہروں سے باریک پتیوں کی طرح ہل رہے تھے اور پھر اس ہاتھ کو دیکھا جو اس کی طرف پھیلا ہوا ساحل کی ریت پر پڑا تھا۔ اور جس کی کلائی میں سات چوڑیاں تھیں۔ اور وہ وہیں ریت میں قریب بیٹھ گیا۔ اور کانچ کی الجھی ہوئی چوڑیوں کو الگ الگ کرنے لگا۔

"ہٹو مجھے سونے دو۔" لڑکی نے اسی طرح لیٹے لیٹے ہلے جلے بغیر کہا اور گل ایک لمحے کے لئے چونک کر اچھل پڑا۔ اس کا خیال تھا۔ لڑکی سو رہی ہے۔ لڑکی نے پھر کہا۔ "تم کب کے یہاں کھڑے ہو۔" میں نے سوچا تم آپ ہی آپ چلے جاؤ گے۔ مجھے دیکھ کر، اب تو چلے جاؤ۔

مجھے نیند آ رہی ہے۔ دیکھو کتنی اچھی دھوپ ہے اف ..... اف ..... ام۔" لڑکی نے اب اپنے دونوں بازو ریت پر پھیلا دیئے اور اپنی طرف سے خوب جم کر سو گئی۔

گل نے اس کے جوڑے میں سجے ہوئے سنہرے پھول کو دیکھا اور پھر کانچ کی چوڑیاں گننے لگا۔ جب پوری سات گن چکا۔ تو اس نے آہستہ سے اس کے جوڑے سے وہ پھول نکال لیا۔

وہ لڑکی پھر اسی طرح لیٹے لیٹے بولی۔" تم ابھی تک گئے نہیں۔"

گل نے کہا۔" میں تمہارے لئے شفق کا پھول لایا ہوں۔ دیکھو۔"

لڑکی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے جوڑے پر گیا۔ گل کا خیال ٹھیک نکلا لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

لڑکی نے کہا۔" لاؤ۔ میرا پھول مجھے دیدو۔"

گل نے پھول آگے بڑھایا۔

لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

گل نے پھول پیچھے ہٹا کے کہا۔" اونہوں۔ ایسے نہیں۔ میں اسے خود تمہارے جوڑے میں لگاؤں گا۔"

"نہیں۔" لڑکی نے بڑی سختی سے کہا۔

"نہیں؟ تو اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

گل پھول اپنے ہاتھ میں لئے دو قدم چلا۔ لڑکی نے کہا۔ اچھا آجاؤ۔

وہ اپنے جوڑے میں پھول لگوانے کے لئے ایک بت کی طرح اکڑ کے بیٹھ گئی۔ اس سے اس کے سینے کا ابھار اور بھی تن گیا۔ اور کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اور گل نے پوچھا۔ اس لڑکی کا نام ضرور پوچھنا چاہیئے۔ اس نے جوڑے میں پھول لگاتے ہوئے کہا۔" تمہارا نام کیا ہے؟"

کشتی تھی۔ گل ادھر مڑ نہ سکتا تھا۔ دوسری طرف ٹیلہ تھا۔ بیچ میں گل پھنس گیا تھا۔ لڑکی نے کوشش کر کے اپنا منہ پرے ہٹا لیا۔ بولی "اب بتاؤ" اس نے گل کے منہ پر دو گھونسے دیئے۔ گل تڑپ کر اپنے مڑے ہوئے ہاتھ پر زور دے کر جو اٹھا تو اوندھی کشتی سیدھی ہو گئی۔ اور لڑکی اس کے اوپر گر گئی۔ گل کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ کشتی کی کیل چبھ گئی تھی۔ مگر اس نے ہنس کر کروٹ بدل ڈالی۔ اب لڑکی ریت پر گر گئی۔ اور اس کے دونوں بازو گل کی گرفت میں تھے اور گل نے اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں کے بالکل قریب لے جا کے کہا "اب کہو"

لڑکی کے ہونٹ یوں پھڑک رہے تھے جیسے مچھلی بہت پتلے پانی میں ہانپتی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے ایک بار دو بار اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مچھلی بہت گہرے پانیوں میں پہنچ گئی۔ جہاں بالکل سکون ہے۔ اور امن ہے اور چین ہے اور وہ دونوں گہرے سبز پانیوں میں ایک دوسرے سے جل پریوں کی طرح لپٹے ہوئے آنکھیں بند کئے ہونٹ سے ہونٹ ملائے تیرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان کے ارد گرد خوب صورت طلائی مچھلیاں گھوم رہی ہیں۔ اور مونگے کی خوشنما آبی جزیروں میں اسفنج حیرت سے اپنی آنکھیں کھولے ان کی طرف تک رہے ہیں۔ اور بانکے چھریرے آبی پودوں کی ریشمی ڈالیاں آہستہ آہستہ مسرت سے ہل رہی ہیں اور ان کے جسم آپ ہی آپ ڈولتے ہوئے سبز و سیاہ پتوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے ان خوش رنگ محلوں کی طرف جا رہے ہیں جہاں سیپیوں میں خوب صورت موتی رہتے ہیں۔ اور رنگا رنگ کے گھونگھے اور سنکھ اپنے مرمریں دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ جس کے دور اوپر کہیں سمندر کے روشندان سے نیلی نیلی مدھم مدھم شعاعیں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آ رہی ہیں۔

لڑکی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس کے ہاتھ کی مٹھیاں آپ ہی آپ کھلتی گئیں۔

گل نے آہستہ سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہم نہیں جانتے"..... لڑکی نے کہا۔

"کیوں نہیں جانتے؟"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"کیوں نہیں بتاؤ گی؟"

لڑکی نے غصّے سے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے اور کہا "اب تم چلے جاؤ۔ یہ سامنے ٹیلے پر میرا گاؤں ہے۔ ابھی شور مچاؤں گی تو اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ تمہارے جسم پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملے گا۔ یہ تمہارا جسم جو اس وقت سمندر مچھلی کی طرح پلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں صرف مچھلی کا کانٹا رہ جائے گا۔"

پھول جوڑے میں سج گیا۔

لڑکی نے ہنس کر کہا "مگر مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں کہ تمہارے اندر وہ مچھلی کا کانٹا بھی ہے کہ نہیں۔ بغیر کانٹے کے بھی تو مچھلیاں ہوتی ہیں نا؟"

گل نے یکایک اسے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ لڑکی تڑپ کر اچھلی اور اس کا ہاتھ زور سے گل کے رخسار پر پڑا۔ گل نے فوراً ایک ہاتھ لڑکی کے منہ پر رکھ دیا۔ اور وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتی تھی اور وہ زور زور سے چلّانا چاہتی تھی مگر گل کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اور اس کا دوسرا ہاتھ بڑی سختی سے اس کے منہ پر جما ہوا تھا گل کو معلوم تھا۔ کہ اگر اس نے لڑکی کو چیخ کا موقعہ دیا۔ تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ یکایک اُسے معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی گرفت سے نکل جا رہی ہے۔ وہ دونوں بازوؤں سے لڑ رہی تھی۔ اور گل صرف ایک بازو سے کام لے رہا تھا۔ اور وہ دونوں لوٹتے پوٹتے بالکل کشتی کے قریب چلے گئے۔ لڑکی نے کوشش کر کے دونوں ہاتھوں سے گل کا ایک ہاتھ پیچھے مروڑ دیا۔ اب ایک طرف

"مہر" لڑکی نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔

"میرا نام گل ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

گل؟..... گل!..... لڑکی کے کانپتے ہوئے ہونٹ کہنے لگے.... گل مہر

"نہیں۔ مہر گل" گل نے جواب دیا اور لڑکی کو سہارا دے کر اٹھایا۔

لڑکی بولی "تم کیا کرتے ہو۔ کہاں رہتے ہو"

گل نے کہا "میں وہ سامنے کے گاؤں میں رہتا ہوں اور مصیرا تیار کرتا ہوں"

"مصیرا کیا ہوتا ہے"

گل نے کہا "مصیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے۔ بالکل ایسی جیسے تمہارے ہونٹوں میں ہوتی ہے۔ نرم نرم۔ پاکیزہ۔ لطیف۔ میٹھی میٹھی چاشنی لئے...."

مہر نے کہا "اب اگر تم نے کوئی شرارت کی تو میں واقعی گاؤں والوں کو بلالوں گی"

گل ہنسا۔ کہنے لگا "میں سب جانتا ہوں۔ گاؤں والے ہیں کہاں۔ وہ تو سب مچھلی پکڑنے گئے ہیں"

مہر نے کہا "تم مصیرا کیوں بناتے ہو۔ مچھلیاں کیوں نہیں پکڑتے"

گل نے کہا "میں مصیرا تیار کرتا ہوں۔ ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور پھر ایک ہی بھگہ دسترخوان پر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مچھلی اور مصیرا.... گل اور مہر....

مہر ذرا پرے سرک گئی، بولی دیکھو میں تم سے کہتی ہوں۔ میرے قریب مت آؤ۔ تم نہیں جانتے میں کتنی خطرناک لڑکی ہوں۔

گل نے پوچھا۔ کتنی خطرناک ہو۔

مہر نے کہا۔ میرے لئے تین خون ہو چکے ہیں۔ اب تک.....

گل نے کہا۔ تو اب چوتھے کی تیاری سمجھو۔

مہر نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوں۔

گل نے کہا۔ ہر گاؤں میں ایک ایسی لڑکی ہوتی ہے جو دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی جب پہلی بار انگڑائی لیتی ہے۔ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی بن جاتی ہے۔ لیکن خوب صورتی میں میری محبوبہ کا جواب نہیں ہے۔

"کون ہے وہ"۔ مہر نے آنکھیں جھپکا کے پوچھا۔

"منیرا" گل نے ہنستے ہوئے کہا۔

مہر نے کہا۔ تمہارا کام اچھا نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دو۔

تو کیا کروں؟

مچھلیاں پکڑا کرو۔

گل نے مہر کی کمر میں ہات ڈال دیا۔

مہر نے اس کا ہات پکڑتے ہوئے کہا "کیا کر رہے ہو؟"

"مچھلی پکڑ رہا ہوں" گل نے جواب دیا۔

مہر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ میں کس آفت میں پھنس گئی۔ میرا منگیتر اس وقت مجھے دیکھ لے تو جان سے مار ڈالے۔

تمہارا منگیتر بھی ہے؟

ہاں اس کا نام عبدل ہے۔

عبدل کیا بہت خوفناک آدمی ہے۔

ہاں۔ سارے گاؤں میں اس جیسا تگڑا جوان نہیں ہے..... مگر۔ مہر نے گل کی طرف دیکھتے

ہوئے بڑے رشک سے کہا۔ وہ تمہاری طرح خوب صورت نہیں ہے۔ اور اتنا کہہ کر مہر نے گل کے سر میں بہت ساری ریت ڈال دی۔ گل اپنے بالوں کو جھٹک کر کہنے لگا۔ میں عبدل سے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔

گل نے کہا۔ اسی لئے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ میں جانتی ہوں تم اس سے ملے بغیر اب نہیں رہو گے اور پھر تمہاری لاش سمندر کے گہرے پانی میں مچھلیاں کھا جائیں گی۔

گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے پاؤں ریت میں گاڑ دیئے اور گھونگھے اور خالی سیپیاں اکٹھی کر کے گھروندا بنانے لگا۔ پھر مہر نے بھی اپنے حنائی پاؤں ریت میں ڈبو دیئے۔ اور اپنا چھوٹا سا گھروندا بنانے لگی۔ گھروندا بنانے میں وہ بڑی مشاق معلوم ہوتی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک خوب صورت ساریت کا محل تعمیر کر لیا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ گل انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور اس کا اپنا گھروندا نامکمل رہ گیا۔ اور جب مہر کا گھروندا بن گیا تو اس نے بھی جلدی جلدی اپنے موٹے کھردرے بڑے بڑے ہاتھوں سے ایک بے ڈول اور بے ڈھنگا سا گھروندا تیار کیا۔ جو خوب صورت محل کے بجائے ایک بدنما تاریک غار سا معلوم ہو رہا تھا۔

مہر نے گل کے گھروندے کو لات مار کے کہا۔ اونہہ یہ بھی کوئی گھروندا ہے۔ گل کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے مہر کے گھروندے کو لات مار دی اور کہا۔ اونہہ، یہ بہت اچھا ہے۔؟

مہر نے پھر گل کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت ساری ریت اس کے سر پر ڈال دی۔ اور ریت اس کے سر میں اس کے کانوں میں اس کی آنکھوں میں۔ اس کے نتھنوں میں اس کے منہ میں چلی گئی اور اس نے اسی حالت میں بالوں کو ایک بار جھٹک کر مہر کو پکڑ لیا۔ اب کے ان رسیلے ہونٹوں کا مزا

ہی کچھ عجیب تھا۔ رگ رگ میں نس نس میں ریت کے خوشگوار ذرّے ایک عجیب گدگدی سی پیدا کر رہے تھے۔

یکایک، دور سمندر کے پانیوں سے گانے کی آواز آئی۔ مہر نے پلٹ کے دیکھا۔ ساحل کے نیم دائرے کے مغربی کونے پر ایک بادبان والی کشتی نمودار ہو چکی تھی۔ مہر نے کشتی پہچان کے کہا "عبدن آگیا"

گل کے بازو تن گئے۔ بولا۔ اچھا ہے۔

مہیں۔ تم چلے جاؤ۔

نہیں۔!

دیکھو۔ میں کہتی ہوں۔ اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اب خون خرابا نہیں چاہتی۔

نہیں!

مہر نے گل کی مٹھوڑی کو ہاتھ لگا کے کہا۔ مہر آج تک کسی کی نہ ہو سکی۔ مگر آج سے وہ تمہاری ہو جائے گی۔۔۔۔

گل مہر کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ بولا۔ سچ کہتی ہو؟

مہر نے کہا۔ دیکھ لینا۔ اب تم جاؤ۔

گل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کب ملو گی۔

کل ملوں گی۔ قبرستان کے پیچھے ناریل کا جو جھنڈ ہے نا۔ واں میرا انتظار کرنا۔ جب چاند ٹھیک جھنڈ کے اوپر پہنچ جائے گا۔ میں آجاؤں گی۔

گل اٹھ کے چلا گیا۔ دور کی کشتی نزدیک آتی گئی۔ اور نزدیک سے جانے والا دور ہوتا گیا۔ آنے والی کشتی کنارے سے آلگی اور جانے والا ایک نقطہ بن کر غائب ہو گیا۔ مہر نے ایک لمبی سانس لی۔

کوئی ساحل کے پتلے پانیوں میں چلتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ مہر وہیں بیٹھی رہی۔ بڑے بڑے پاؤں مضبوط ٹانگیں چلتی ہوئی اس کے بالکل قریب آکے رک گئیں۔ مہر اُٹھ کھڑی ہوئی اور عبدل کی طرف دیکھنے لگی۔ عبدل نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی۔ دھوپ میں اس کا سیاہ مضبوط جسم ایک خوب صورت پتوار کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے ننھنے پھیلے ہوئے تھے۔ رخسار اُبھرے ہوئے تھے اور آنکھیں تنگ گڑھوں میں چمکتی تھیں۔ عبدل نے ٹوٹے ہوئے گھرندوں کو دیکھا۔ اور پوچھا۔ یہ کون تھا!

مہر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ ایک اجنبی تھا۔

عبدل نے بڑی سختی سے مہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مہر نے زور سے عبدل کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور آگے بڑھ کر گاؤں کی طرف چلنے لگی۔

تھوڑی دیر کے لئے عبدل اسے گھورتا رہا۔ پھر مسکرا کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

یوں تو ساری دنیا چاند کو ناریل کے جھنڈ پر لٹکتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن یہ انتظار کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ چاند کتنی دیر میں ناریل کے جھنڈ کے اوپر پہنچتا ہے۔ وہ جامن کے پیڑ میں بڑی جلدی پہنچ جاتا ہے، پیڑوں کی ڈالیوں میں پہنچتے ہوئے اُسے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ آم کی شاخوں میں پہنچتے ہوئے اُسے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ لیکن جب وہ ان سب درختوں سے اونچا ہو کے ناریل کے جھنڈ میں پہنچتا ہے تو رات آدھی سے زیادہ گزر جاتی ہے لوگ سو جاتے ہیں۔ گھروں کی روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ ماہی گیروں کے سمندری گیت چپ ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور اس سناٹے میں صرف چنبیلی کی خوشبو رہتی ہے اور سمندر کی گونج بہتی ہے۔ اور چاندنی کی مے بہتی ہے۔ اور اس خوشبو میں، اس گونج میں اس مے میں سارا جہان سو جاتا ہے۔ ساحل کے ٹیلوں کی چمکتی ہوئی ریت کسی کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی ہے۔ اور پھر جا کے

کہیں چاند اونچے ناریل کے جھنڈ میں آتا ہے اور کسی کے آہستہ خرام، کنوارے پاؤں خشک پتوں میں زندگی جگاتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ اور کسی کا دھڑکتا ہوا۔ سینہ کسی کے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگ جاتا ہے اور کسی کے انتظار کرتے ہوئے جلتے ہوئے ہونٹ کسی کے ٹھنڈے شیریں خنک ہونٹوں میں مل جاتے ہیں۔ اور شانوں پر اور کانوں کے قریب اور گردن سے چھوتے ہوئے گھنے بالوں کی گہری عطر بیز گداز تاریکی دور تک روح اور جسم کے اندر کانپتے ہوئے سایوں کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ اور کوئی آہستہ سے کہتا ہے گل۔ اور کوئی آہستہ سے جواب دیتا ہے مہر۔ اور پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کوئی کچھ نہیں سنتا۔ چاروں طرف کا محیط سناٹا دو دلوں کی دھڑکنوں کو، دو گہرے زمینی جذبوں کو، دو تیز تیز جلتے ہوئے سانسوں کو محبت کے متبرک لوبان کے دھوئیں کی طرح چاندنی میں گھول دیتا ہے اور یہ چاندنی اور یہ سناٹا اور یہ سمندر ایک گونج بن کر ان تاریک محلوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں نرم و نازک سیپیاں اپنا منہ کھولے محبت کے موتی کے انتظار میں ہیں۔ اور خوش رنگ گھونگھے اپنے خواب آور مرمریں گھروں سے نکل کر آبی پودوں کا سہارا لئے کھڑے ہیں۔ اور اس لازوال روشنی کو دیکھ رہے ہیں جو دور اوپر سمندر کے روشندان سے کانپتی، تھرتھراتی نیلی نیلی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آرہی ہے۔

چاند بہت دیر تک دور اوپر ناریل کے جھنڈ میں کسی شوخ حسینہ کے نقرئی آویزے کی طرح کانپتا رہا۔ اور دور نیچے وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کی آغوش میں کانپتے رہے۔ پھر اک دم جیسے وہ کانپ کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ کوئی اور بھی اس جھنڈ کی طرف چلا آرہا تھا ڈراتا ہوا تیز تیز غصیلے قدموں سے آگے بڑھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لئے ناریل کے تنے سے لگ گئے۔ اور ان کے چاروں طرف ناریل کے درخت کھڑے تھے۔ اور وہ سیاہ اجنبی غصے سے آگے بڑھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ یکایک جھنڈ کے ایک کھلے

حلقے میں سے اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر مہر نے اسے پہچان لیا۔ اور اک دبی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی اور پھر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مگر عبدل نے وہ چیخ سن لی تھی اور اب وہ سیدھا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ گل اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے بازوؤں کو رہا تھا عبدل اب ایک کھلی جگہ میں تھا۔ جہاں چاروں طرف سے ناریل چھٹ سے گئے تھے۔ گل نے مہر کو چھوڑ دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے مہر کے ہاتھ کی ایک ہلکی سی گرفت محسوس بھی کی۔ مگر وہ رکا نہیں۔ آگے بڑھ گیا۔

اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

بلا کچھ کہے سنے وہ ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ کسی نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ کوئی کسی سے بولا نہیں۔ کسی نے کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ اور اپنے جسم و جان کی پوری طاقت سے لڑنے لگے۔ اور ان کے چاروں طرف خاموشی تھی۔ اور ناریل کے درخت بھی خاموشی سے کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور مہر جیاتی پر ہات رکھے خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں بڑی مستعدی سے بڑی خاموشی سے مگر بڑی خونخواری سے لڑ رہے تھے اور بس سناٹے میں صرف پتوں کے چرمرانے کی آواز آتی یا کہیں زمین پر کوئی سوکھی شاخ چٹخ جاتی۔ ورنہ مکمل خاموشی تھی اور ان دونوں لڑنے والوں کی تیز تیز سانسیں کبھی ایک اوپر ہو جاتا۔ کبھی دوسرا۔ گل کی داہنی آنکھ کے اوپر سے خون بہنے لگا۔ خون اس کے چہرے پر پھیلنے لگا اور وہ دونوں لڑتے گئے آخر ایک داؤں میں عبدل بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ وہ گل سے زیادہ تگڑا تھا۔ لیکن گل زیادہ پھرتیلا تھا۔ گل اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں بجلی کی طرح چمکا۔ مگر مہر نے فوراً بڑی مضبوطی سے اس کا ہات پکڑ لیا۔ مہر کا اپنا ہاتھ زخمی ہو گیا۔

مہر نے کہا۔ نہیں..... اب چوتھا خون نہیں ہوگا۔ اس وقت اسے اپنی آواز بڑی عجیب

معلوم ہوئی۔

گل عبدل کی چھاتی سے اتر آیا۔ عبدل آہستہ آہستہ سے اٹھا۔ گل چھراہات میں لئے عبدل کے قریب کھڑا اسے تاکتا رہا۔ عبدل نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا۔ ایسی مایوسی، ایسی حسرت سے دیکھا کہ مہران کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ پھر عبدل نے گل کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے بازو گر گئے۔ اور اس نے اپنی گردن اک عجب انداز میں ملائی اور گھوم کر چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ گل اور مہر اس کے پیچھے پیچھے مگر اس سے دور رہ کر چلنے لگے۔ عبدل گاؤں کی طرف نہیں گیا۔ وہ جھنڈ سے نکل کر شوالے کے نیچے ساحل کی طرف، چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے گھوم کر مہر اور گل کو سلام کیا اور اچھل کر ساحل کے کنارے چلا گیا۔ یہاں اس نے ایک بادبان والی کشتی کھولی۔ جال کو سمیٹ کے کشتی میں رکھا۔ اور کشتی سمندر کے اندر لے گیا۔

مہر نے چلا کے کہا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔

کشتی دور ہوتی گئی۔ وہ چاندنی کے دھارے پر جا رہی تھی۔ سمندر کے بیچ میں ایک شاہراہ بنی ہوئی تھی۔ یہ شاہراہ وہاں جاتی ہے جہاں چاند کا دیس ہے۔ مہجور محبتوں اور الفتوں کا دیس۔ عبدل گاتا گاتا اسی شاہراہ پر ہو لیا۔

مہر نے کہا۔ ٹھہرو.... ٹھہرو۔

رات کے سناٹے میں مہر کی آواز گونج گونج کر لوٹ گئی۔ اور پھر عبدل کا گیت ابھر آیا۔ یہ گیت اس مچھی کا معلوم ہوتا تھا۔ جس کے گلے میں بنسی کا کانٹا پھنس جائے اور حلق سے نکلنے سے انکار کر دے۔

مہر رونے لگی۔

گل نے کہا۔ روتی کیوں ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں میں گیا ہے۔ آج چاندنی رات ہے آج سارے
ں والے بیچ سمندر میں جا کے جال ڈالتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ صبح وہ سب کے ساتھ
ئے گا۔ دیکھ لینا۔

لیکن عبدل صبح کو سب کے ساتھ نہیں آیا۔ رات بھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مچھلیاں
تارہا۔ اور گیت گاتا رہا۔ اور سب کو ہنساتا رہا۔ آج رات اس کے جال میں بہت سی مچھلیاں
ں۔ ڈھیروں سے ڈھیر۔ ایسی موٹی تازی خوب صورت مچھلیاں ان ماہی گیروں نے بہت مدت
بعد پکڑی تھیں۔ وہ لوگ بہت خوش تھے۔ صبح کے وقت جب سب لوگ لوٹنے لگے تو عبدل
کہا۔ میں ابھی دیر میں آؤں گا۔ تم لوگ چلو۔ عبدل نے اپنی مچھلیاں مہر کے لئے بھجوا دیں۔ یہ
ب اسے دے دینا۔ اس میں بھی کوئی عجب بات نہ تھی جو کسی کو شک پڑتا۔ اور پھر وہ سب سے
ہو کے سمندر کے اس حصے کی طرف چلا گیا۔ جہاں کہتے ہیں بڑے سے بڑے طوفان کے وقت
لہریں ساکن رہتی ہیں اور جس کے اندر مچھلیاں نے گھیرا باندھ کے کنول کا پھول بنا رکھا ہے۔
گیر کبھی ادھر نہیں جاتے۔ نہ انہوں نے کبھی اس مقام کو دیکھا ہے۔ صرف اپنے بزرگوں سے
ہے کہ مغربی کنارے سے دو میل آگے بیچ سمندر میں وہ مقام ہے جہاں ساکن سمندر کے اندر
خوفناک بھنور چلتا ہے۔ اور جس کے اندر مچھلیاں اک کنول کا پھول نما دائرہ بنائے ہوئے
تی ہیں۔

عبدل چلا گیا۔ وہ صبح کو واپس نہیں آیا۔ وہ دوپہر کو بھی نہیں لوٹا۔ شام کو اس کی لاش
رے سے آ لگی۔ اور گاؤں والوں نے اُسے اُٹھا کے اپنے قبرستان میں دفن کر دیا۔

مجھے کسی سے نفرت نہیں

ہوا یہ کہ ایک عرصے سے ملک صاحب سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ آخری بار کوئی تین ماہ ہوئے جب وہ مجھ سے ملے تھے تو ایک فلم کمپنی بنانے کے چکر میں تھے۔ اس کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آج صبح صبح ناشتے پر مجھے ان کا خیال آیا تو میں نے سوچا چلو دادر میں چل کے انہیں دیکھتا جاؤں۔ ان کا چکر کس منزل پر ہے۔

دادر میں ملک صاحب کے گھر پہنچا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ بھابی نے بتایا "وہ آفس گئے ہوئے ہیں۔"

"آفس کہاں لیا ہے؟"

"اوپیرا ہاؤس کے قریب" دائیں طرف گلی میں، جو لال جی بھائی مول جی بھائی دھوکے والا کی بلڈنگ کا بڑا پھاٹک ہے نا۔ اس کے اندر پہلی منزل پر"

میں نے دل میں سوچا۔ چلو بہت اچھا ہوا۔ آخر ملک صاحب نے اپنی فلم کمپنی بنا
ڈالی۔ میں ان کے آفس میں جا کے مبارک باد کیوں نہ دے آؤں۔ یہی سوچ کر میں
سی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا تو بھابی نے کہا "چائے پی کر جائیے نا"

میں نے پوچھا "گھر میں چینی ہے؟"

"چینی؟" بھابی نے خفا ہو کے کہا "چینی تو نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے راشن سے ملتی
ے اور بہت کم ملتی ہے۔ اگر آپ کو چائے یہاں پینی ہی تھی تو کم از کم چینی تو گھر سے لے
تے ـــ

آئندہ احتیاط برتوں گا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھابی دروازے پر کھڑی
ں۔ چلتے چلتے مجھے زینے سے ٹھوکر لگی تو گھبرا کے بولیں "آپ بھی کیا غضب کرتے ہیں۔
تیاط سے اتریئے نا۔ یہ زینہ بہت کمزور ہے کہیں ٹوٹ گیا تو وہ مالک مکان دوبارہ بنوا کے
ں دے گا۔"

میں چپ چاپ اپنا گھٹنہ سہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔ دراصل ان معاملوں میں زیادہ بات
نا اچھا نہیں ہوتا۔ اور میں بات بھی کیا کر سکتا تھا کیونکہ ان معاملوں میں بھابی کا ذوق
ی وہی ہے جو میری بیوی کا ہے۔ میری بیوی کو اگر گھر میں مہمان آجائے تو مہمان سے
ئے کے برتنوں کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ ہائے کہیں مہمان کی بد احتیاطی سے چائے کے
تن ٹوٹ نہ جائیں۔ اسی خدشے ہی خدشے میں وہ اکثر مہمانوں کو چائے کے لئے پوچھنا ہی
ول جاتی ہیں۔ اور اگر کہیں مہمان بدقسمتی سے دہرے بدن کا بھاری بھرکم ثابت ہوا، تو
ھر میں فالتو چارپائی جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا مہمان اگر غلطی سے صوفے پر بیٹھ
ی جائے تو ان کی نگاہ ہر وقت اس پر رہتی ہے مہمان اگر دائیں طرف مڑا تو ان کی نگاہ بھی

دائیں طرف گھومی۔ مہمان بائیں طرف گھوما تو ان کی نگاہ بھی بائیں طرف مڑ گئی۔ صدمے نے ذرا بھی چوں کی تو میری بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ اسی قسم کے حادثوں کے باعث انہیں آج کل اختلاج رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے مہمان کو اختلاج ہوتا ہے بعد میں بیوی کو ہوتا ہے۔ اسی لئے اس وقت میں نے بھابی سے زیادہ بات نہیں کی۔ اور چپ چاپ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ورنہ یہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں جواب دینے کی کوشش کرتا تو بھابی کو ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔ خیر کسی طرح لال جی بھائی مول جی دھوکے والا کی باں میں پہنچا تو معلوم ہوا یہاں کسی فلم کمپنی کا دفتر نہیں ہے۔ پہلی منزل پہ باہر جلی حروف ایک بورڈ پر لکھا تھا:

تیل دھارا

ایک خوشبودار مرکب تیل جو ہر مرض کا شرطیہ علاج ہے

موجد: ڈاکٹر ملک

میں بورڈ پڑھ کے جلدی سے آفس میں چلا گیا۔ آفس میں ایک بہت بڑی میز پر سر لکائے ملک صاحب یعنی کہ ڈاکٹر ملک صاحب یعنی کہ ڈاکٹر ملک صاحب اونگھ رہے۔ میں نے جاتے ہی ایک ٹھوکا دیا، ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے اور بڑی شفقت سے بغل گیر ہوتے کہنے لگے "میں لکھ پتی ہونے والا ہوں مجھے مبارک باد دو"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

ملک صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ دراصل ملک صاحب کے مزاج میں کوہبت دخل ہے وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کے انگلیاں نچا نچا کے، جبڑہ ہلا ہلا کے بات کرتے۔ آنکھیں نیچی کئے۔ گردن جھکائے۔ کندھے سکوڑے بڑی عاجزی سے اس طرح

رتے ہیں، گویا اپنی بیوی کے سامنے بول رہے ہیں۔ دراصل ایک شوہر کے مزاج کی تعمیر میں ں کی بیوی کے مزاج کو بہت دخل ہوتا ہے۔ اور اگر نہ ہو تو شوہر کو ہر وقت بے دخل ہو رنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے جب ملک صاحب نے قریب قریب نیم سرگوشی میں مجھ سے کہا "میں لکھ پتی بننے والا ہوں"۔ تو ان کی آواز میں ایسی لرزش تھی، گویا وہ کسی گناہ کے لئے ی بیوی سے معافی مانگ رہے ہوں۔ میں نے کہا "بھائی، آخر بتاؤ، ماجرا کیا ہے۔ تم تو ب فلم کمپنی کھول رہے تھے یہ تیل دھارا کیا لے بیٹھے؟"

ملک صاحب کہنے لگے یہ شیشے کی الماریوں میں تم ان بوتلوں کو دیکھ سکتے ہو، یہ میری ایجاد ہے۔ یہ خوشبودار تیل اس زمانے کی سب سے بڑی ایجاد ہے"۔ میری بیوی کے سوا...." پھر ھانس کر آگے چلے" یہ تیل ماتھے پر لگالو تو سر درد دور ہو جاتا ہے۔ ناک کے نتھنوں میں الو تو زکام غائب ہو جاتا ہے۔ کان میں ڈالو تو کان کی میل صاف ہو جاتی ہے۔ چندیا پر لگالو تو چندیا صاف ہو جاتی ہے۔ یہ تیل بیک وقت ہال صفا پوڈر بھی ہے اور بال اُگانے ا بھی تیل ہے"۔

"وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولے" اس تیل کو دن میں لگاؤ تو بال صاف کر دیتا ہے، رات کو لگاؤ تو بال اُگاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تیل سفید بالوں کو کالا کرتا ہے اور کالے آدمیوں کو گورا کرتا ہے۔ آپ اسے سر پر لگا سکتے ہیں اور ضرورت پڑے تو پی بھی سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ارنڈی کا تیل بھی شامل ہے جو قبض کشا ہوتا ہے، اور انتڑیوں کو صاف کرتا ہے گویا یہ تیل ہر مرض کا جواب ہے، بہترین خضاب ہے اور خوش گوار جلاب ہے"۔ اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد ملک صاحب پھر مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے بڑی محبت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا اب

نک کے لاکھ بوتلیں اس تیل کی بک گئیں ؟"

ملک صاحب بولے " ابھی تک تو صرف تین بوتلیں بکی ہیں۔ مگر دراصل پبلسٹی اور تم جا ہو آج کل کا زمانہ ....."

ملک صاحب آگے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر نہیں کہہ پائے۔ کیونکہ محمود آ گیا۔ محمود ہم دونو دوست ہے اور بہت ہی جذباتی آدمی ہے۔ وہ حسین سیٹھ سرگھے والا کی دوکان پر کپڑا بیچتا اور فرصت کے وقت نظمی کہانیاں لکھتا ہے۔ جو ابھی تک کہیں فروخت نہیں ہو سکیں، اس سے اس کے جذباتی ہونے کا اندازہ لگ سکتا ہے، آج وہ خلافِ معمول بہت خوش نظر آتا تھا۔ میں نے پوچھا " محمود پیارے کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہے ہو، کیا نوکری سے جواب مل گیا ؟"

وہ بولا " نہیں بھائی ابھی نوکری سے جواب تو نہیں ملا، لیکن ایک ایسی ترکیب ذہن میں آئی ہے، جس سے نوکری کو جواب دیا جا سکتا ہے اور ہم مہینوں لکھ پتی ہو سکتے ہیں۔"

ملک صاحب نے پوچھا " کتنے دنوں میں ؟ دراصل محمود بھائی یہ سوال بہت اہم ہے کہ آدمی کتنے دنوں میں لکھ پتی ہو سکتا ہے مثال کے طور پر تم اس تیل دھارا کو لے لو۔ پچھلے تین ماہ میں میں نے اس کی تین بوتلیں فروخت کی ہیں۔ اس رفتار سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں دو سال اور زندہ رہ جاؤں تو ضرور لکھ پتی ہو سکتا ہوں۔"

" بے شک، بے شک" محمود نے منہ ہلا کے کہا " مگر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر برس کے دن پچاس ہزار۔"

" بالکل۔ بالکل۔" ملک صاحب نے مزید تائید فرماتے ہوئے اپنے کندھے سکوڑ کر اور اپنی ناک اونچی کر کے محمود کی طرف شکائتاً دیکھا اور پھر پوچھا " کتنے دن لگیں گے، لکھ پتی بننے میں

"کوئی ایک سال کا عرصہ چاہیئے۔"

ملک صاحب نے پوچھا "تو ایک سال تک کیا کریں گے، یہی تیل دھارا بیچیں گے۔؟"

"بے شک، بے شک" محمود نے بے خیالی میں کہا اور پھر چونکنا ہو کے بولا" ایسا نہیں ہے ملک صاحب۔ میری ترکیب سے پہلے تو سینکڑوں کی آمدنی ہو گی۔ پھر ہزاروں کی۔ اور ایک سال کے بعد لاکھوں کی آمدنی ہو گی۔"

"جلدی سے بتاؤ نا" ملک صاحب نے ذرا چڑ کے کہا۔

محمود بولا "بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے ملک صاحب کہ آپ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ بات ملک ہے کہ حالاتِ زمانہ نے آپ کو تیل دھارا بیچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور مجھے کپڑا بیچنے پر۔ مگر ہم دونوں ادبی ذوق رکھتے ہیں اور یہ ہمارا دوست (میری طرف اشارہ کر کے) تو شاعر ہے۔ کیوں بھئی، کل کے مشاعرے سے تمہیں کیا ملا؟"

"آنے جانے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اور دس روپے نقد سوڈا لیمن وغیرہ مفت"

"اچھے رہے" ملک صاحب نے خوش ہو کے میری طرف دیکھا۔

"بے شک، بے شک" محمود کی نگاہوں نے تقریباً اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈال دیا۔

ملک صاحب نے کہا "تو وہ ترکیب بتاؤ نا۔ جلدی سے۔"

محمود کچھ کہنے کو تھا کہ تیل دھارا کے آفس میں گردھاری داخل ہوا۔ گردھاری ہم تینوں دوستوں کا چوتھا دوست ہے۔ مگر اس وقت وہ ایک دشمن کی طرح بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص گندی اور میلی تھی۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر الجھی سلجھی شکنیں اور پاؤں دھول میں اٹے ہوئے تھے بہر حال ہم نے اس کے غصّے کے باوجود اسے اپنی نئی ترکیب میں شامل کر لیا۔ محمود کی ترکیب بہت آسان تھی جیسے لکھ پتی بننے کی ہر ترکیب آسان ہوتی

ہے ہم سب لوگ ایک فلمی کہانی لکھیں گے اور پھر مل کے بیچیں گے ۔ اور سب پیسے آپس بانٹ لیں گے ۔ بس یہ ایک کہانی سنڈیکیٹ ہوگا۔ جہاں پر ڈیوسروں کو ہر طرح کی ہر قما کی ہر مزاج کی کہانیاں دستیاب ہو سکیں گی۔ کہانی جس میں ہیرو ہیروئن کو بھگائے لے جا اور کہانی جس میں ہیروئن ہیرو کو بھگائے لے جاتی ہے، یا وہ کہانی جس میں ولین ہیرو ا ہیروئن دونوں کو بھگا کے لے جاتا ہے غرضیکہ ہر طرح کا فارمولا استعمال کیا جائے گا۔"

میں نے کہا "بالکل تیل دھارا کا فارمولا معلوم ہوتا ہے۔"

"بے شک ، بے شک ۔" محمود نے سر ہلا کر کہا ۔

گردھاری نے میز پر زور سے مکا مار کے کہا "مگر یہ سکیم چل سکتی ہے ۔ ہم اس سے لاکھوں روپے کما سکتے ہیں۔ ہمارے پاس کیا نہیں ہے ۔عقل ہے تہذیب ہے ۔ ہنر ہے ۔ فکر رسا ہے ۔"

"اور تیل دھارا ہے ۔" ملک صاحب بولے ۔

"بے شک ، بے شک ۔" محمود کہنے لگا ۔

گردھاری نے میز پر دوسرا مکا مار کے کہا "محمود تم ہر وقت بے شک ، بے شک نہ کہا کرو۔ مجھے سخت غصہ آتا ہے ۔اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ متحد ہو جائیں اور متحد ہو کر دنیا میں کام کریں ۔ دنیا میں جب تک ہم اپنا گروپ نہ بنائیں گے ۔ہمیں کوئی نہیں مانے گا ۔عباس کو دیکھو۔ اپنا گروپ بنا کے کام کرنے لگا ہے ۔آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے ۔کس لئے صرف اس لئے کہ اس کا اپنا گروپ تھا ۔تم عباس سے کم لائق ہو۔محمود۔ تم ملک ۔ میں گردھاری ۔تم نادم ، تم کتنے بڑے شاعر ہو۔کون تمہیں پوچھتا ہے ۔ ارے میاں دنیا میں گروپ بنا کے کام کرو۔ یہ گدھا عباس۔ میں اُسے ٹھیک کر دوں گا ۔ میں اسے بتا دوں

گا۔ میں تم کو محمود۔ تم کو۔ اس کے خلاف گروپ کا لیڈر بناؤں گا۔ دنیا دیکھے گی۔ اور عباس یاد کرے گا کہ کوئی اس کے سامنے چھاتی تان کے کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے نیچا دکھاؤں گا۔ وہ میرے پاؤں پڑے گا۔ گڑگڑائے گا۔ روئے گا لیکن میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ گدھا۔ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ میں اسے وہ ذلیل کروں گا۔ وہ ذلیل کروں گا۔۔۔۔"

محمود نے پوچھا "کیا بات ہے۔ عباس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم نہیں جانتے۔" گردھاری نے اور بھی خفا ہو کے کہا "عباس کا نام مت لو جی میرے سامنے۔"

میں نے کہا "مگر ہم کہاں لے رہے ہیں۔ تم خود ہی اس کا ذکر کر رہے ہو اور میں سن رہا ہوں۔ حالانکہ وہ میرا دوست ہے۔"

ملک صاحب نے بات کا پہلو بدل کے محمود کی سکیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اس میں کئی شاخسانے نکالے۔ یہ طے کیا گیا کہ کہانیاں بیچنے کے ساتھ ساتھ تیل وغیرہ بھی بیچی جائے۔ اس کے علاوہ محمود بھائی حسین سیٹھ مرگھے والا کی دوکان پر کپڑا بھی بیچتے رہیں گردھاری جو چھ ماہ سے بے کار تھا۔ بدستور نوکری کی تلاش کرتا رہے اور دفتروں کے چکر لگاتا رہے۔ اس دوران میں اگر کوئی مشاعرہ کے لئے دعوت دے دے تو میں یہ کوشش کروں کہ اپنے تینوں دوستوں کو اس مشاعرے میں مدعو کروں۔ نظمیں سب کے لئے خود لکھوں تخلص بدل بدل کے۔ غرضیکہ ایک اچھی خاصی سکیم تیار ہو گئی۔ اسی گفتگو میں ڈھائی بج گئے۔ اور تین ہونے کو آئے۔ میں چاہتا تھا کہ محمود کھسک جائے اور گردھاری بھی چلا جائے تو ملک صاحب کو کسی ہوٹل میں کھانے کے لئے مدعو کروں۔ کیونکہ میری جیب بہت زیادہ بھاری نہ تھی، مگر یہ نہ ہوا۔ کسی نہ کسی طرح بات ہی سے بات نکلتی رہی۔ گفتگو چلتی رہی۔ گردھاری کے ہونٹوں پر

پیڑیاں سوکھتی گئیں۔ محمود ایک مجبور کھلونے کی طرح گردن ہلا ہلا کر "بے شک" کہتا گیا۔ اور ملک صاحب کے شانے سکڑنے لگے۔ اور ان کی اندر رہتی ہوئی آنکھوں پر سیاہ پپوٹے ٹھیرے ہوئے پانی پر سیاہ کائی کی طرح پھیلتے گئے جب ساڑھے تین ہونے کو آئے تو میں نے ملک سے کہا "ارے باتوں باتوں میں کھانا تو بالکل ہی بھول گئے۔ چلئے کسی ہوٹل میں چل کے کھالیں۔"

محمود اور گردھاری بھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ملک صاحب نے کہا "بھائی نادم، میں بہت نام ہوں مجھے بھوک بالکل نہیں ہے۔"

"چلئے نا ملک صاحب" محمود بولا۔ خود نادم کہہ رہے ہیں، تو آپ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسے تو مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔"

گردھاری نے کہا "میں تو کھا کے آیا ہوں۔"

"تھوڑا سا چکھ لینا۔ دو چار لقمے۔"

"نہیں، نہیں" گردھاری بڑے غصے سے بولا "میں کھا کے آیا ہوں۔" میں نے اس کے باہنہ میں اپنی باہنہ ڈال دی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کے لے گیا۔ پہلے میرا ارادہ ایک درمیانی درجے کے ہوٹل میں جانے کا تھا۔ مگر پہلے میرا ارادہ صرف ملک صاحب کو ساتھ لے جانے کا تھا پہلے دو آدمی ہوتے، اب چار تھے۔ اس لئے میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اور ایک سستے سے ہوٹل میں گھس گیا، یہ بھیا جی کا ہوٹل تھا۔ یہاں کھانے میں صرف پوری بھاجی ملتی ہے۔ تیل کی پوری، آلو کی بھاجی۔ نل کا پانی۔ سب ملا کے چھ آنے میں ایک آدمی کا کھانا ہوتا ہے۔ مگر آج چونکہ ملک صاحب کو بھوک نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے صرف دس پوریاں کھائیں۔ محمود نے بارہ۔ میں نے پندرہ اور گردھاری تو گھر سے کھا کے آیا تھا۔ اس لئے اس کے لئے پچیس پوریاں منگائی گئیں۔ اس کے علاوہ اس کے لئے دہی

بڑے کی دو پلیٹوں کا آرڈر بھی دیا گیا، جب کھانا ختم ہوا، تو میرے مشاعرے کی بقیہ رقم بھی ختم ہو چکی تھی۔ میری جیب میں صرف پانچ آنے کے پیسے رہ گئے۔ جب ہوٹل سے نکلے تو محمود کو ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ اور ملک کو تیل دھارا کی ایک شیشی بیچنے کے لئے کہیں جانا تھا۔ خیر وہ دونوں تو چلے گئے اور ہم دونوں لکھ پتیوں کو فٹ پاتھ پر اکیلا چھوڑ گئے۔

گردھاری نے مجھ سے کہا "جانتے ہو میں نے آج تین دن کے بعد کھانا کھایا ہے"

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ سے کہا "کافی پیو گے؟" گردھاری نے کہا "کیوں نہیں پیئں گے؟" میں نے سامنے اشارہ کیا "تو چلو سامنے کی دوکان میں، یہ اس دوکان کا مالک ایرانی میرا واقف ہے" ایرانی کی دوکان کے اندر پہنچ کر گردھاری نے اپنے دھول میں اٹے ہوئے پاؤں دھوئے۔ اپنا چپل دھویا۔ جس کے تلے کے اندر ایک بہت بڑا سوراخ تھا اور اس نے اپنا منہ دھویا۔ پھر اس نے اپنے بالوں میں کنگھی کی اور میرے ساتھ ایک کیبن میں آ بیٹھا۔ بوائے نے گرم گرم کافی کے دو کپ ہمارے سامنے لا کے رکھے۔

گردھاری نے کپ اٹھایا۔ کافی کی سوندھی سوندھی مہک اور پیالے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر بل کھاتی ہوئی، پھیلتی ہوئی، فضا میں گم ہوتی گئی گردھاری کا چہرہ صاف ہوتا گیا۔ ماتھے کی شکنیں دور ہوتی گئیں۔ گردن کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑتی گئیں۔ ہونٹوں کی پپڑیاں غائب ہو گئیں۔ اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں کسی مہربان خواب کے سایوں میں کھو گئیں ــــ

میں نے کہا "اچھا اب بتاؤ تمہیں عباس سے کیوں نفرت ہے۔؟"

"نفرت؟" گردھاری نے آہستہ سے بڑے نرم اور ملائم لہجے میں کہا "مجھے عباس سے نفرت نہیں ہے۔ مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے۔ آج میں بھوکا نہیں ہوں۔"

گردھاری کے چہرے کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا مشرق سے آ رہی ہے۔
جیسے خوشبو چاروں طرف چھا رہی ہے جیسے بنجر اور ویران کھیتوں میں گندم کے لاکھوں پودے
اُگ رہے ہیں۔

روشنی کے کیڑے

بنگلے کا ایک پھاٹک سالم تھا۔ لیکن دوسرا ٹوٹا ہوا تھا اور کسی طرح بند نہ ہو سکتا تھا، جب تک نیا پھاٹک نہ لگایا جائے۔ شوبھا نے کئی بار اپنے شوہر دیال سے کہا کہ وہ جلد سے جلد نیا پھاٹک لگوائے۔ لیکن دیال ہر بار ٹال جاتا تھا۔

یہ ٹوٹا ہوا پھاٹک ایک گیہارا سا بن گیا تھا۔ جس میں سے ہو کر بستی کے لوگ بھاجی والے ٹھیلے والے، پھل والے۔ شریر بچے اور نوکری پیشہ لوگ سولہویں گلی کو جاتے تھے۔ بنگلے کا ایک چوتھائی فرلانگ کا گیہارا پار کیا اور سولہویں گلی میں اپنا سودا سلف بیچنے کے لئے پہنچ گئے۔ ورنہ انہیں بنگلوں کی نصف میل لمبی قطار طے کر کے سولہویں گلی میں پہنچنا پڑتا اور دیال کا جی کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگوں پر اس شارٹ کٹ کو بند کر دیں۔

اس نے یہ بنگلہ نیا نیا خریدا تھا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ یہ بنگلہ اسے نیا نیا ورثہ میں ملا تھا۔

بالکل اسی طرح جس طرح اُسے نئی بیوی ملی تھی اور نئی موٹر ملی تھی، ورنہ چند ماہ پہلے یہ چیزیں اس کے سان گمان میں نہ تھیں۔

وہ بیس برس کا تھا جب ڈھانڈا اینڈ کمپنی میں ایک سو پچیس روپے کا کلرک بھرتی ہوا تھا۔ ہر سال دو روپے ترقی ہوتی تھی۔ پانچ برس بعد اس کی تنخواہ ایک سو پینتیس روپے ہو گئی تھی۔ ان پانچ برسوں میں اس کی ماں نے اس کی شادی کے لئے بہت کوشش کی لیکن اس کی جان پہچان کے لوگوں میں کوئی ایک سو پینتیس روپے کے کلرک کو رشتہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا اور اس کی ماں اپنے بیٹے کی شادی کے ارمان دل ہی میں لئے لئے مرگئی اور وہ اپنی کھولی میں تنہا رہ گیا۔

وہ ابھی تک اپنے سر پر ایک چھوٹی سی گھٹی ہوئی سی پگڑی باندھتا تھا اور شلوار اور قمیص پہن کر دفتر آتا تھا۔ اس کے سر پر اس کی چھوٹی سی پگڑی ایسی کسی ہوئی بندھی ہوتی جیسے کسی نے صبح صبح اس کے سر پر دس جوتے مارے ہوں، یہی اس کے چہرے کی کیفیت ہوتی۔ جب کبھی اس کی فرم کا باس اُسے کسی غلطی پر اپنے کیبن میں بلا کر ڈانٹتا۔ وہاں کا چہرہ کسی سوکھے ہوئے بانس کی طرح زرد اور خشک تھا اور اس کی آنکھیں ہر وقت کسی نامعلوم خوف اور دہشت سے سہمی سہمی نظر آتیں۔ وہ خاصہ نجی، محنتی، دبو اور بزدل انسان تھا اور ہر وقت سر جھکا کر اپنی میز پر کام کئے جاتا تھا۔ دوسرے کلرک اکثر اس کا مذاق اڑاتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے اپنا کام اسے سونپتے رہتے تھے۔ اس لئے بھی وہ بہت زیادہ مصروف رہتا تھا۔ پھر دن میں دو تین بار فرم کے باس کی جو ڈانٹ اس پر پڑتی تھی اس سے خوفزدہ ہو کر وہ بالکل جونک کی طرح اپنی میز سے چپک جاتا تھا اور دھیرے دھیرے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائلوں کو چاٹنے لگتا تھا۔

پھر یکایک ایک دن یہ سب کچھ بدل گیا۔ ایک دن لنچ سے پہلے باس نے اسے اپنی کیبن

میں طلب کیا۔ وہ ڈانٹ کھانے کے لئے تیار ہو کر اپنی پگڑی سنبھالتا ہوا اٹھا اور دوسرے کلرک محظوظ ہو کر پُر شرارت کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ یہ روز کا معمول تھا اس کا "اب ڈانٹ پڑنے والی ہے۔ اور رات گزرنے والی ہے!" ایک کلرک گانے لگتا اور وہ گھبرایا ہوا اپنی پگڑی سنبھالتا جیسے اپنے سر کو کسی آنے والے خوفناک وار سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھتا اور کانپتی ٹانگوں سے باس کی کیبن میں گھس جاتا۔ ڈانٹ کھا کر چند منٹ کے بعد جب وہ اس کیبن سے نکلتا تو اس کے ہونٹ کانپتے نظر آتے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوتیں اور وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنی میز پر واپس آجاتا اور سر جھکا کر کام کرنے لگتا۔ یہ روز کا معمول تھا آج بھی یہی ہوگا۔

لیکن آج خلافِ توقع بات ہوئی۔ جب وہ کیبن کے اندر پہنچا، تو دیکھا کہ باس کے قریب ایک وکیل سیاہ کوٹ اور سیاہ بُو لگائے ہوئے اس کے پاس بیٹھا ہے اور گہری متجسس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ان نگاہوں کو دیکھ کر دیال خوف اور دہشت سے لرز گیا۔ اس نے سوچا۔ مجھ سے ضرور کوئی ایسی خوفناک غلطی ہوئی ہے جس کے لئے باس نے ایک وکیل کو بلا کر غالباً اس پر مقدمہ دائر کرنے کی سوچی ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا ذہن مختلف فائلوں کی طرف لوٹ گیا لیکن اس کے ذہن کی ایسی کیفیت ہو رہی تھی کہ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ اتنی جلدی میں وہ صرف یہ سوچ سکا کہ اُسے ہر الزام سے بچنے کے لئے صاف انکار کر دینا چاہیئے۔

باس نے مسکرا کر اُس سے پوچھا "تمہارا کوئی چچا جنوبی افریقہ میں ہے؟"

"نہیں" دیال سر ہلا کے صاف صاف مکر گیا۔

"جھوٹ مت بولو، صاف صاف بتاؤ!" باس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

دیال سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

"ہے" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا جیسے کسی بڑے سنگین جرم کا اقبال کر رہا ہو۔ "مگر میری اس سے کبھی کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی، کبھی میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کبھی میں نے اسے دیکھا نہیں!"

"اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں" باس نے یکایک نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے تمہارا چچا ملاوارام مر گیا!"

"اچھا!" بے اختیار دیال کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ گھبرا کر اپنے باس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ممکن ہے وہاں سے کوئی ایسا اشارہ ملے جس سے اسے پتہ چلے کہ اس خبر پر مسرور ہونا چاہیئے یا رنجور اور" جب اس نے دیکھا کہ اس کا باس مسکرا رہا ہے، تو جواب میں وہ بھی مسکرانے لگا۔ کیونکہ اب یہی درست معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے چچا کی موت پر مسکرائے۔!

"بیٹھو" باس نے اپنی میز کے سامنے ایک خالی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں، نہیں" وہ ڈر کر کرسی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"بیٹھو!" باس نے ڈپٹ کر کہا اور دیال سہما سہما ایک چوہے کی طرح دبک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج تک ایسا حادثہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ باس نے کبھی اسے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا، یہ بالکل ایسا تھا جیسے زمین اپنے محور پر الٹی گھومنے لگے۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے" اب وہ سیاہ کوٹ والا وکیل اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے بولا "تمہارا چچا ملاوارام مر گیا ہے اور تمہارے لئے دس لاکھ روپے بینک میں چھوڑ گیا ہے اور ایک بنگلہ اس شہر میں اور پانچ دکانیں .... اور ......"

وکیل کچھ کہتا جا رہا تھا لیکن دس لاکھ سے آگے دیال کچھ نہ سن سکا وکیل کی آواز دور، اور۔ دور ہوتی گئی اور اس کی جگہ دیال کے کانوں میں کسی سائرن کی تیز تیز گھوں گھوں گونجنے لگی۔

ں سائرن کی آواز بڑھتی گئی بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ چکرا کر کرسی سے گر کر بے ہوش ہو گیا!

وکیل نے اور اس کے باس نے دیال کی ہر طرح سے مدد کی۔ اسے بنگلے کا قبضہ دلا دیا، جو نے کب سے بند پڑا تھا۔ پانچ دکانوں کی ملکیت اس کے نام لکھ دی گئی اور دس لاکھ روپے ں کے نام بینک میں ٹرانسفر کر دیا گیا اور جب یہ سب کام ہو گیا، تو باس نے از راہ ہمدردی ں بیٹی شوبھا کی شادی بھی دیال سے کر دی۔ کیونکہ دیال بالکل اکیلا تھا اور کسی طرح اپنی حفاظت د نہیں کر سکتا تھا۔ شوبھا ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ایک بزنس مین کی بیٹی تھی، وہ دولت کی عادی ں اور جو دولت کے عادی ہوتے ہیں۔ صرف وہی دولت کو سنبھال کر رکھ سکتے ہیں اور عرف ہیں کا حق دولت پر جائز ہوتا ہے۔ ایسا شوبھا سوچتی تھی۔ اس لئے دس لاکھ کا شوہر پا کر وہ ی طرح کسی کی شکر گزار نہ ہوئی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اس کا حق تھا جو اُسے ملا اس میں عجیب ت کیا تھی۔ عجیب بات تو وہ ہوتی اگر اُسے ایک سو پینتیس روپے والا شوہر ملتا۔

لیکن دیال اپنی بیوی سے کچھ خائف رہتا تھا۔ ہر وقت اُسے ایسا احساس رہتا تھا جیسے ں نے کسی عورت سے نہیں اپنی فرم کے مالک سے بیاہ کیا ہے۔ جس کی فائیل پر وہ ہمیشہ نہائی تابعدار لکھنے پر مجبور تھا۔

اس بنگلے میں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ اس نئے ماحول کا عادی نہیں ا تھا۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس روز جو وہ کرسی سے گرا تھا تو اب تک پوری طرح ش میں نہیں آیا ہے۔ کبھی کبھی اس کے چہرے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی لمبے رھے خواب میں چل رہا ہے لوگوں سے باتیں کرتے وقت ابھی تک اُس کے چہرے پر وہ سادگی دلپن اور التجا سی ہوتی جو گویا لوگوں سے کہہ رہی ہوتی دیکھو، میں دولت مند ضرور ہو گیا ہوں ن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے!

بنگلے میں آتے ہی دوسرے دن جب وہ ہر روز کی طرح پگڑی باندھ کر دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تھا تو شوبھا نے غصّے میں آکر اس کی پگڑی کو شلے سے گھسیٹ کر اتار لیا تھا اور اس سے کہا تھا۔

"آج سے تم دفتر نہیں جاؤ گے!"

اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں!

"کیوں؟"

"امیر لوگ کام نہیں کرتے!"

"کیوں نہیں کرتے؟"

"نہیں کرتے" کہہ جو دیا!" شوبھا تیز لہجے میں بولی۔ تمہیں احساس ہونا چاہیئے کہ اب تم ایک لکھ پتی ہو!"

اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی اسے کسی طرح کا یہ احساس نہ ہوا کہ لکھ پتی ہونے سے اس کی صلاحیتوں میں کسی طرح کا اضافہ ہوا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ پہلے ہی جیسا ایک معمولی سا آدمی ہے جس کے حالات البتہ غیر معمولی ہو گئے ہیں۔ بلکہ اب تو اس کی فائلیں بھی اس سے چھن گئی ہیں۔ یہ سوچ کر اُسے اپنے دِل کے اندر ایک بڑا خلا سا محسوس ہوا اور یکایک اُسے احساس ہوا کہ ڈانٹ ڈپٹ اور گھرکیوں کے باوجود وہ اپنے دفتر کے کام کو پسند کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ ایک عمدہ ڈرافٹ لکھ لیتا تھا تو اس کے دل میں مسرت کی لہر سی دَوڑ جاتی تھی۔ دوسرے کلرک اکثر اس سے مذاق کرتے رہتے تھے۔ لیکن انکی دوستی میں بھی ایک عجیب سی اپنائیت تھی۔ کبھی کبھی کسی کلرک سے بیڑی مانگ کر پیتے ہوئے جب وہ اپنے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا، تو عمارتوں کے اوپر آسمان میں دوڑتے ہوئے پرندے اُسے

بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور وہ بیڑی کا تلخ تیز گاڑھا دھواں نتھنوں سے نکالتے ہوئے ان کے ساتھ چند لمحوں کے لئے نیلے آسمان میں ڈولنے لگتا تھا۔ چند لمحوں کا ہی یہ احساس ہوتا تھا لیکن کتنا خوبصورت ہوتا تھا اب لوگوں کی نظر میں وہ اپنائیت نہیں رہی۔ کیسی اجنبی اجنبی نگاہوں سے سب لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ جیسے وہ جات باہر کر دیا گیا ہوا۔

اب وہ اکثر گلیہارے میں جامن کے ایک پیڑ کے نیچے آرام کرسی ڈال کر اونگھتا رہتا یا کوئی کتاب لے کر پڑھتا، یا گلیہارے سے گزرنے والے لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ یہ لوگ جو کل تک اس کے اس قدر قریب تھے۔ اب اتنے دور کیوں چلے گئے ہیں۔ لیکن اسے گلیہارے میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو دیکھنا بہت پسند تھا۔ ایک بوڑھا بوڑھی تھے۔ دونوں بھاجی بیچنے والے تھے۔ بڈھا اپنے سر پر آلو اور پیاز کی بھاری ٹوکری لاد کر چلتا تھا اور اپنی بوڑھی بیوی کو کم وزن والی ترکاری کی ٹوکری اٹھواتا تھا۔ وہ دونوں بہت بوڑھے تھے اور چلتے چلتے ایسا معلوم ہوتا تھا، ہر گھڑی زندگی کی شاہراہ پر ساتھ ساتھ چلتے چلتے بوڑھے ہوئے ہوں۔ وہ دونوں کہیں دور سے آتے تھے اور بانٹتے ہوئے گلیہارے میں داخل ہو کر چھوٹے پام کی محراب دار شاخوں کے نیچے بیٹھ جاتے تھے اور لمبی لمبی مورپنکھیوں کے سائے کبھی تو ان کی جھرّیوں کو چھپا لیتے اور کبھی ان کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی محبت کو اجاگر کر دیتے۔ بوڑھا اپنی دھوتی کی انٹی سے ایک بیڑی نکال کر سلگاتا ایک کش خود لیتا دوسرا بڑھیا کو لگانے دیتا۔ چند منٹ کی دھیمی دھیمی باتوں کے بعد بڑھیا اپنے پلّو میں بندھی ہوئی پانوں کی ایک ڈبیہ نکالتی۔ کراچونا نکالتی، خشک کتھے کی ڈلی کو توڑ کر ایک پان اپنے شوہر کو دیتی۔ ایک اپنے کلّے میں دباتی۔ پھر بوڑھا اپنی بیوی کا چھابا اٹھا کر اس کے سر پر رکھتا، آلوؤں اور پیاز کا ٹوکرا اپنے سر پر اٹھاتا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

ایک نوجوان جوڑا بھی آتا تھا۔ پہلے وہ دونوں الگ آتے تھے نوجوان آموں کی ٹوکری اٹھائے ہوئے آتا اور لڑکی جامنوں کی ٹوکری اٹھائے مٹکتی آتی۔ دونوں جوان تھے، سانولے اور مضبوط! لڑکی کی آنکھیں بے حد سیاہ تھیں اور دانت بہت سفید تھے اور جب وہ ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا جیسے بجلی کا کوندا لپک گیا۔ دیال اس کی ہنسی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ایک دن وہ دونوں امرود کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور دھیرے دھیرے کچھ باتیں کر رہے تھے اور لڑکی اس کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ کتنا جی چاہتا تھا دیال کا کہ ان کے پاس جا کر بیٹھ جائے۔ باتوں اور آموں کا بھاؤ تاؤ کرے۔ یکایک لڑکی نے نظر اٹھا کر اوپر شاخوں پر لٹکتے ہوئے امرودوں کو دیکھا اور نوجوان نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے اپنا ہاتھ امرود توڑنے کے لئے اوپر اٹھایا۔ کہ وہ دیال کی نگاہیں اپنی طرف جمی دیکھ کر رک گیا۔ یکایک دیال نے اپنا منہ موڑ لیا جیسے وہ کچھ نہیں دیکھ رہا ہے۔ جیسے وہ اس ایک ہنسی کی خاطر باغ کے سارے امرودوں کو توڑ لینے کی دعوت دے رہا ہو۔ شاخ کی لچک کر نیچے آکر اوپر جانے کی صدا آئی۔ پتوں نے تالیاں سی بجائیں۔ لڑکی کی ہنسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اب شاید وہ امرود دکھا رہی تھی اور اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے اپنے نوجوان ساتھی کو دیکھ رہی تھی۔ دیال کا جی چاہا وہ نگاہیں موڑ کر انہیں دیکھے اس لڑکی کی گود میں سارے امرود توڑ کر ڈال دے۔ اس آم والے کا سارا جھابا خرید لے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ ان لوگوں کے لئے ایک اجنبی تھا۔ وہ ایک لکھ پتی تھا۔ اب وہ معمولی آدمیوں سے معمولی آدمیوں کی طرح بات نہ کر سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی ایک عجیب سی حسرت اور افسردگی سے اس کا دل بھر گیا۔ اس کے کانوں میں نوجوان اور لڑکی کے ساتھ ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ اور شوبھا تو کبھی ساتھ نہیں ہنستے تھے۔ شوبھا کے پاس بہت اچھی اچھی ساڑیاں تھیں اور اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کبھی ساتھ نہیں ہنستے تھے۔

اس دن سے آم والا اور جامن والی ساتھ آنے لگے۔ کبھی تو وہ امرودوں کے پیڑوں کے نیچے بیٹھتے اور کبھی دور جا کر شریفے کے پیڑوں کے نیچے۔ اور وہ ہر بار ایک خاص موقعے پر لگا ہیں موڑ لیتا ہے۔ یہ جیسے ایک طرح کی اجازت ہوتی تھی، نوجوان آم والے کے لئے پھل توڑ لینے کی۔ بے نگاہوں ہی نگاہوں میں ان تینوں کے درمیان ایک خوبصورت سمجھوتہ سا پیدا ہو چلا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو سی ہو رہی ہو۔ اس جوڑے کے آنے کا ہر روز دیال بہت بے صبری سے انتظار کرتا تھا۔ ایک دن تو جرأت سے کام لے کر دیال نے آم والے سے آم خرید لئے تھے۔ اس پر آم والے نے مسکرا کر کہا تھا "جامن نہیں لو گے۔؟"

"نہیں!"

"نہیں لے لو!" وہ التجا کرنے لگا۔ "آم کھانے کے بعد جامن اگر کھاؤ تو بدہضمی نہیں ہوتی۔ آم کی بادی کو جامن کاٹ دیتی ہے!"

"جیسے مرد کی آوارگی کو عورت کی وفا!" بے اختیار دیال کے منہ سے نکل گیا اور وہ زور سے ہنس پڑی۔ اتنے قریب بجلی کا کوندا لپکا تھا کہ دیال کچھ پریشان سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور لڑکی کا ملتجی جامنوں سے مجبور کر دیال کی طرف اٹھ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسی من موہنی ملاحت تھی جیسے پکے ہوئے پھل کے اندر بہار کا رس دوڑتا ہے!

دو بچیاں ننھے ننھے اودے اودے فراک پہنے ہوئے بستے بغل میں دبائے ہوئے بالوں میں رنگین ربن لگائے چڑیوں کی طرح چہچہاتی ہوئی صبح سویرے اسکول جانے کے لئے اس شارٹ کٹ سے گزرتی تھیں اور پھولوں کی کیاریوں کو حسرت سے دیکھتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ ایک دن اس نے دلیری سے کام لے کر ان دونوں بچیوں کو گلاب کے دو پھول پیش کئے تھے۔ اور جس طرح کمسن وقار اور خود مختاری سے ان دو بچیوں نے وہ پھول قبول کئے اس نے انہیں

شہزادیوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ حالانکہ ان کے ادوے فراک بہت ہی معمولی کپڑے کے تھے، اور جگہ جگہ سے رفو کئے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ بالکل شہزادیاں تھیں اور انہوں نے اس روز اور اس کے بعد ہر روز اس سے پھول قبول کر کے دیال پر احسان کیا تھا اور دیال خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

یہ تھے اور بھی لوگ تھے، جنہیں آتے جاتے گلیہارے میں سے گزرتے ہوئے وہ صبح و شام دیکھتا رہتا۔ نور اور سائے کی شطرنجیوں سے کانپتا ہوا گلیہارا اتنا روشن نظر آتا تھا کہ آنے جانے والے لوگ بے اختیار یہاں پہنچ کر دم لیتے۔ سانس سنبھالتے گھڑی دو گھڑی ہنس بول کر کھلے آسمان اور پھولوں اور پتوں سے لدے درختوں کو دیکھ لیتے۔ دیکھ لیتے کہ دنیا اپنے آلام و مصائب کے باوجود خوبصورت ہے۔ اس گلیہارے میں بیٹھ کر وہ اپنے خوابوں کو جمع کرتے اس کی روشنی سے نمو لیتے۔ اس کے سکوت کے اندر سے کہیں پر چھپی ہوئی کوئی ایسی طاقت ڈھونڈتے جو انہیں دنیا کے رنج و محن کا مقابلہ کرنے کی ہمت دلا دے اور پھر چند لمحوں کے بعد اپنے خالی جسموں کو شادابی سے لبریز کر کے آگے چلے جاتے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

لیکن یہ گلیہارا شوبھا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

پہلے وہ بولی۔

"مگر یہ گلیہارا ہمارا ہے۔ یہ لوگ اس میں سے کیوں گزرتے ہیں؟"

دیال بولا "مگر یہ لوگ جو اس میں سے گزرتے ہیں، ہمارا کیا لیتے ہیں۔؟"

"کچھ نہیں لیتے۔" مگر گزرتے کیوں ہیں؟ —"تم ایک بڑھی بلوا کر پھاٹک ٹھیک کراؤ۔!"

چند دنوں کے ٹال مٹول کے بعد بڑھئی کو بلوانا پڑا۔ معلوم ہوا پھاٹک ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ نیا بنے گا! اور نئے پھاٹک پر بہت خرچ آئے گا۔ اس لئے اطمینان کی ایک سانس لے

کر دیال نے بڑھئی کو رخصت کر دیا۔

لیکن شوبھا اپنی ضد پر ڈٹی رہی۔ اس نے خود بڑھئی کو نیا پھاٹک بنانے کا آرڈر دے دیا۔ چند ہفتوں کے بعد معلوم ہوا کہ بڑھئی ایڈوانس لے کر کہیں چلا گیا۔ دراصل یہ بھی دیال کی ایک چال تھی۔ وہ گلیہارے میں پھاٹک لگا کر اسے بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شوبھا نے کچھ عرصے کے بعد ایک نئے بڑھئی کو بلوا کر اُس سے پھاٹک بنانے کو کہا۔ چند ہفتوں کے بعد جب دوسرا پھاٹک بن کر آیا، تو اس میں کنڈا نہیں تھا۔ شوبھا بہت خفا ہوئی پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خود دیال نے ایسا آرڈر دیا تھا۔ اس پر شوبھا نے دیال کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور دیال سر جھکائے اپنے گھر کے باس کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔ شوبھا نے بڑھئی کو کنڈا لگانے کے لئے کہا، اور بڑھئی کنڈا لگانے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا اور پھر کئی دن تک نہیں آیا۔

پھر بنگلے میں ایک ایسی واردات ہوئی جس سے شوبھا کا دھیان کچھ عرصے کے لئے پھاٹک سے ہٹ گیا۔ چاہے یہ حقیقت نہ ہو۔ لیکن دیال کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ پھاٹک والی بات بھول چکی ہے۔ ہوا یہ کہ برسات کے آنے پر شوبھا کے بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں کینچوے آنے لگے۔ پتلے پتلے لال لال کچے اور ننگے گوشت کے رنگ کے کینچوے۔ اس طرح رینگ رینگ کر کلبلاتے ہوئے چلتے تھے کہ شوبھا کا دل متلانے لگتا اور اس نے چیخ چیخ کر دیال کو اس حادثے سے مطلع کیا۔

دیال نے جب غور کیا، تو معلوم ہوا کہ باتھ روم کے باہر کا ایک سیمنٹ پائپ جہاں پر وہ زمین دوز ہوتا تھا۔ وہاں سے ٹوٹ گیا ہے اس کے سوراخ میں سے کینچوے نکلتے ہیں اور روشنی اور کھلی ہوا کو دیکھ کر باہر نکل آتے ہیں۔ کینچوے سیمنٹ کے پائپ کے سوراخ سے نکل کر پائپ پر رینگنے لگتے تھے اور دیر تک کھلی ہوا۔ کھلے آسمان اور روشنی اور دھوپ کا لطف لیتے

تھے۔ ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے لپٹ جاتے تھے۔ اور یونہی اپنی سی زندگی میں آرام اور سکون کے چند گھنٹے گزار کے سہ پہر کے قریب پھر سینٹ پائپ کے سوراخ میں داخل ہو کر غائب ہو جاتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی من چلا ان میں سے نکل کر رینگتا ہوا باتھ روم کے باہر کے دروازے کی کسی دراڑ سے داخل ہو کر باتھ روم کے اندر گھس آتا تھا اور شوبھا اسے دیکھ کر اس طرح چیختی تھی۔ جیسے اس کے گھر میں بلا اجازت کوئی اجنبی گھس آیا ہو! ایسے موقع پر دیال نمک یا فنائیل ڈال کر اس کینچوے کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

لیکن اس سے شوبھا کی تسلی نہ ہوئی!

"میرے خیال میں اس باہر والے سوراخ کو بند کر دینا چاہیئے۔ جس سے یہ کینچوے اس موری سے باہر نکلتے ہیں!"

"باہر نکلتے ہیں تو ہمارا کیا لیتے ہیں؟" دیال نے پوچھا۔ "دھوپ سیکتے ہیں بیچارے!"

"تم تو احمق ہو دیکھتے نہیں ہو دو ایک کینچوے ہمارے باتھ روم کے اندر بھی گھس آتے ہیں!"

"گھس آتے ہیں تو اپنے کئے کی سزا بھی پاتے ہیں" دیال بولا۔

"نہیں میں اس سوراخ کو بند کرا کے دم لوں گی!" شوبھا بولی، پھر کراہت آمیز لہجے میں کہنے لگی "تم کیسے عجیب آدمی ہو؟ کینچوے دیکھ کر متلی نہیں آتی؟"

دیال نے آہستہ سے اپنے زرد دبلے پتلے جسم پر نگاہ ڈالی "اپنے جسم کے معاملے میں ہر شخص مجبور ہے!" اس کی آواز میں عجیب معذرت سی تھی۔

"لو کینچوے شخص کب سے ہونے لگے؟ — کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو" شوبھا برافروختہ ہو کے بولی "میں نہیں جانتی، تم کچھ کرو۔ یا Pest control — والوں کو بلاؤ۔ لیکن ان کینچوؤں کو یہاں سے ختم کر دینا چاہیئے!"

کام کون سا مشکل تھا۔ پہنچ سے پہلے دیال نے ایک مرمت والے کو بُلا کر سیمنٹ پائپ کے سوراخ میں سیمنٹ بھروا کے اُسے بند کر دیا۔ باتھ روم میں کینچوے آنے بند ہو گئے۔ اب دھوپ سینکنے کا کوئی راستہ بھی ان کے لئے نہ رہا!

شوبھانے خوشی سے تالی بجائی اور دیال کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسی نظروں سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ دوڑی دوڑی باہر چلی گئی!

جب وہ شام کو نہا دھو کر سفید کرتا اور پائجامہ پہن کر بہت اچھے موڈ میں ایک سگریٹ سلگاتا ہوا چہل قدمی کرنے کے لئے گلمہارے کی جانب مڑا تو وہ یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ گلمہارا اس سرے سے اُس سرے تک سونا پڑا ہے۔ کہیں پر کوئی بشر آتا جاتا نظر نہیں آتا۔ پیڑ اپنے پتوں کے کان لٹکائے اداس اور گناہ گار سے کھڑے ہیں!

گھبرا کر اس نے جو گلمہارے کے پھاٹک کی طرف دیکھا، تو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اسے ایک نیا پھاٹک، اپنے آہنی کنڈوں کے ساتھ بند نظر آیا۔ کنڈے میں ایک بھاری تالا پڑا تھا۔

ایک لمحے کے لئے وہ حیران اور ششدر کھڑا رہ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس گلمہارے کے پھاٹک پر تالا نہیں پڑا ہے، دولت نے اس کے بنگلے کے سامنے ایک بہت بڑی صلیب لٹکا دی ہے جس پر اب اُسے شب و روز لٹکنا ہوگا!

وہ دیر تک اس بند پھاٹک کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آنکھیں جھکائے ہوئے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اور اس سُونے گلمہارے کے طویل سناٹے میں دُور تک اکیلا ٹہلتا چلا گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کے دل میں خیال آیا گلمہارے میں سے گزرنے والے ان لوگوں کا، جو بند پھاٹک کو دیکھ کر لوٹ جائیں گے اور گلی گلی بھٹکیں گے اور ان کیڑوں کا، جو تاریک اور بند موریوں کے سڑتے پانیوں میں رہتے ہوئے کسی دوسرے روزن کیلئے بھٹکیں گے اس روشنی کی تلاش میں جس پر دوسروں کا قبضہ ہے۔

ڈنر

سیٹھ پردمن چوکھی بے حد دیانت دار صنعت کار تھا۔ شہر میں اس کے سات کارخانے تھے۔ گیارہ بلڈنگیں تھیں۔ پانچ داشتائیں تھیں۔ اور صرف ایک بیوی تھی۔ صبح و شام وہ اپنے کام میں مصروف رہتا کیوں کہ وہ ایک مصروف آدمی تھا۔ لنچ پر وہ صرف ایک گلاس پھلوں کے رس کا پیتا تھا۔ کیوں کہ اس سے زیادہ کھانے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ ہاں شام کے چھ بجے سے سات بجے تک، وہ ایک گھنٹہ وہ باری باری اپنی مختلف داشتاؤں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ساڑھے سات بجے اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ پھر سارا وقت اس کی بیوی اور بچوں کا ہوتا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سمنی تھا۔ بچوں میں تین تو لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا گووند اور اس سے چھوٹا مکند بزنس میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ سب سے چھوٹا ہنس مکھ لڑکا اپنی بہن کامنی کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور سب سے چھوٹی لڑکی منیا ابھی چھ سال کی تھی۔ وہ سب لوگ رات کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ دن بھر کھانا

نکسانے سے اور لگاتار ڈٹ کر کام کرنے سے پردمن چوکھی کی بھوک بھی چمک اٹھتی تھی۔ شام کے وقت رات کے آٹھ بجتے بجتے اس کے لئے اپنی بھوک کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آج سے اپنی ایک داشتہ کے ہاں پندرہ منٹ زیادہ ہو گئے۔ اس لئے جب اس کی گاڑی پورچ میں رکی اور جب اس نے اپنی بیوی کو دیکھا، جو ہمیشہ اس وقت خود پورچ میں آ کے اس کا استقبال کرتی تھی، تو پیار کی رسمی باتوں کو ترک کرتے ہوئے وہ فوراً چلایا۔

"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

سمتی نے مسکرا کر کہا "ڈنر تیار ہے۔"

ڈنر کی گانگ بجی۔ ڈائننگ ہال کے باہر واش بیسن میں ہاتھ دھو کر نئے نئے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے نہایت بے صبری سے پوچھا۔

"کیا پکا ہے؟"

سمتی کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آئی۔ بولی۔

"کیا چاہیئے؟ جو بولو گے حاضر ہو جائے گا۔"

"ہوں.... ہوں..... دیکھتے ہیں تمہاری آج کی کارگزاری....." وہ ڈائننگ ہال کے اندر آتے ہوئے بولا۔

پھر پردمن چوکھی نے میز کا جائزہ لیا جو شادی کی عورت کی طرح سجی تھی۔ اور ہر روز اسی طرح سجتی تھی۔ اس وقت چوکھی کی آنکھیں اور نتھنے بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔ باپ رے! کتنی سخت بھوک لگی ہے اُسے اور کھانے کے لئے ہے کیا؟ — مگر سب کچھ تو ہے۔ ریشمی چکن، کباب، چکن برد اور چکن مصالحہ تین طرح کے تو چکن ہیں۔ پھر بھنا ہوا تیتر ہے۔ سبزیوں میں مکھن میں دم دے کر پکایا ہوا گوبھی کا ثابت پھول ہے۔ جو اسے بہت پسند ہے۔ ساگ پنیر ہے مٹن میں سیدنگ

ہے دہی کی بوندیاں، دھلی ہوئی ماش کی دال۔ ایک ایک دانہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کی طرح الگ الگ، لیجئے یہ روسٹ ران بھی رکھی ہے اور پشکہ چاولوں کا اور چاول بھی اعلیٰ ترین با کے.... حسینی باسمتی جو صرف دہرہ دون کے چند گاؤں میں بوئی جاتی ہے۔ یہ پشکہ؟ —— پلاؤ اور خشکے کے بیچ کی چیز ہے۔ اس لئے سمتی نے اس کا نام پشکہ رکھا ہے۔ یہ اس کے خاوند کی مرغوب غذا ہے۔ پشکہ نہ تو بریانی ایسا مرغن ہوتا ہے۔ نہ خشکے کی طرح پھیکا۔ دونوں کی بہترین خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ پھر تین طرح کا میٹھا تھا۔

پردمن نے میز دیکھ کر اطمینان کی سانس لی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب تک دوسری گانگ بج چکی تھی، سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر آ چکے تھے۔ پردمن سمتی گووند، نندو، کامنی، ہنس مکھ اور منیا.... کھانے پر حملہ شروع ہو گیا۔

صحت سب کی عمدہ دکھائی دیتی تھی۔ اچھی صحت والے آدمی کی پہچان ڈنر ٹیبل پر فوراً ہو جاتی ہے۔ کیسے کھائے پیئے۔ ہرے بھرے چہرے تھے، سب کھانے میں جٹے ہوئے تھے۔ جبڑے ان مصروف مشینوں کی طرح چل رہے تھے۔ جن کے سر پر مالک کھڑا ہو۔ چاندی کے چمچوں سے سالن نکالا جا رہا تھا۔ کالی کالی چمکتی ہوئی آنکھیں فرائی لیور کی طرح تھیں ہونٹ ریشمی کباب گال پھولے پھولے تازہ دم کیے!

دس منٹ تک کوئی نہیں بولا۔

پھر جب معدہ آدھا بھر گیا تو چونکھی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک چھوٹی سی ڈکار لی اور کہا۔

"میں نندو کو انگلینڈ بھیج رہا ہوں۔"

سمتی نے چاندی کے کانٹے سے کھیلتے ہوئے کہا "کیوں۔؟"

"یہاں بلیپ، کے کارخانے میں دو مشینیں ٹوٹ گئی ہیں۔ فوری طور پر دو نئی مشینوں کی ضرورت،

ہے۔ خود پسند کر کے آئے گا۔"

نند کا چہرہ اپنی مسکراہٹ کو چھپائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ انگلینڈ تک اس کا پہلا سفر ہو گا۔ یہ تو
ستر دہ ہو آیا تھا۔ مگر لندن؟ وہ اپنی پلیٹ میں مرغی کی ایک ٹانگ رکھے عالم تصور میں مغربی
حسیناؤں کی ننگی ٹانگوں سے کھیلنے لگا۔

کامنی بولی "میں کالج میں ایک ڈرامہ کر رہی ہوں۔ مجھے تین ہزار روپے چاہئیں۔"

"کالج کے ڈرامے پر جو خرچ آئے گا کیا وہ خود کالج ادا نہیں کرے گا؟"

"نہیں ۔۔۔۔" کامنی بولی "ڈیڈی! بات یہ ہے کہ کالج کی جو آفیشل ڈرامہ کلب ہے اس میں
مجھے سیکریٹری نہیں چنا گیا۔ اس لئے میں نے دوسری ڈرامہ کلب کھول لی ہے۔ میں ان کو شکست
دینا چاہتی ہوں ۔۔۔۔"

"تمہیں رقم مل جائے گی زیادہ کی ضرورت ہو تو اور مانگ لینا۔"

"تھینک یو ڈیڈ ۔۔۔۔۔"

شری پردمن چوکھی جب کالکا میل سے علی گڑھ اسٹیشن پر رکے تو ہزاروں آدمی ان کو لینے
کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ پردمن چوکھی اس بار اپنی بیوی ستی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ کیونکہ جب
وہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں اپنی عزت، شان، جلسے جلوس وغیرہ کا ذکر کرتے تو ان کی بیوی کو
مطلق یقین نہیں آتا تھا۔

مسٹر چوکھی عرصے تک ٹونڈلے میں ایک غیر معروف وکیل کی حیثیت سے اپنی زندگی اور موکلوں
کے مقدمے خراب کرتے رہے۔ آخر ایک روز دماغ میں لہر آئی اور وہ کانگریس میں داخل ہو گئے۔ برسوں
کی دبی ہوئی تیزی، چالاکی اور شاطری ایک دم زور دے کے ابھری اور وہ ہینڈلوم انڈسٹری کے

سرکردہ لیڈر رماں سے گئے۔ ان کے بڑے لڑکے گووند کو ٹیڑھی گڑھوال میں فروٹ کیننگ انڈسٹری کھولنے کے لئے ایک معقول رقم گورنمنٹ کو آپریٹیو سے عطا کی گئی۔ چند برسوں میں انہوں نے ڈونڈ میں ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کر لی۔ جو ملک و قوم کی خدمت کا نتیجہ تھی۔

ان دنوں علی گڑھ میں ہینڈلوم انڈسٹری کی سالانہ نمائش ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں شری چوکھو اپنی دھرم پتنی کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔

سمنی ان کی دھرم پتنی نے جوان کی آدھ بھگت علی گڑھ میں دیکھی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں وہ کچھ کہتی مگر اس وقت اُسے بھوک نے بے تاب کر رکھا تھا۔ دبی زبان میں اس نے اپنے شوہر سے اسٹیشن پر کہا بھی مگر شوہر نے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا۔

"ابھی تو جلوس نکلے گا۔ ابھی بھوجن کیسے ہوگا۔ بھوجن تو وہاں ہوگا۔ جہاں ہم ٹھہریں گے۔"

"مگر مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

"توبہ کرو..... قوم کی خدمت میں بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے!"

بڑا لمبا جلوس تھا۔ بڑے اونچے نعرے تھے۔ بے حد موٹی دبیز گرد تھی۔ جب جلوس نشان محل باسر پہنچا جہاں لیڈر لوگ ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس وقت تک مسز سمتی کا گورا رنگ راستہ کے گرد و غبار کے میک اپ سے چاکلیٹ رنگ ہو چکا تھا مگر بھوک اس قدر تیز تھی کہ اس نے اپنے چہرے کا خیال نہ کرتے ہوئے فوراً بھوجن کے لئے آرڈر دے دیا۔

شری پردمن چوکھی جو ہوٹلوں میں جا کر خفیہ طور پر گوشت چکن، کباب، سب کچھ کھاتے تھے اور سب کچھ پیتے بھی تھے۔ اُس وقت ہاتھ جوڑ کر نمرتا پوروک دینے کی۔

"ہم شدھ ساتوک بھوجن کھاتے ہیں۔"

کوٹھی کے مالک پنڈت ہردے دیال نے جواباً عرض کی۔

" جو دال دلیا ہوگا، حاضر کر دیا جائے گا۔"

یاد رہے۔ چوکھی نے پھر یاد دہانی کرائی کہ بہت سادہ کھانا ہو اور بہت ہی کم۔۔۔ ہم دونوں کو اس وقت بھوک نہیں ہے اور بھوک ہو بھی تو ہم بہت کم کھاتے ہیں۔ ایسی ہی عادت ہے ہماری مہاراج !"

چوکیوں پر چاندی کے تھالوں میں رسوئیے نے کھانا پروس دیا۔ کشمیری دم آلو تھے۔ مصالحہ بھرے ٹنڈے تھے۔ آلو مٹر بھری شملہ مرچ تھی۔ فرائی پرول۔ تین طرح کی دالیں تھیں۔ دال اُڑد دال ارہر اور دال مسور۔ دہی بڑے تھے اور ہری ٹھنڈی کھٹے میں تیار کی گئی اور مٹر کا پلاؤ اور تلے ہوئے کیلوں کی پاپڑیا۔ آم رس اور پانچ چھ قسم کے اچار۔ اور دس بارہ اقسام کی مٹھائیاں چاندی کے ورق لگے ہوئے۔۔۔۔ ساتھ میں آلو بھرے پراٹھے۔ گوبھی بھرے پراٹھے اور مولی بھرے پراٹھے اور عام سادہ پراٹھے مکھن میں تلے ہوئے۔ اور سادہ چپاتیاں اور تنوری نان اور فرائی کٹھل۔ گوشت کے ٹکڑوں کی طرح کاٹا ہوا۔ فیرنی اور کھیرا اور کچالو کے ٹکڑے مچھلی کی شکل کے کاٹے ہوئے اور موہن بھوگ اور جل جیرا۔

"بے حد سادہ کھانا ہے۔" پنڈت ہردیال نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔"

"بس ایسا ہی کھانا ہم کھاتے ہیں۔" شری چوکھی نے انکساری سے سر جھکا کر تھال اپنے نزدیک کھسکا لیا۔" پنڈت جی! آپ تو جانتے ہیں ہمارا دیش ایک غریب ملک ہے!"

چوکھی سنٹرل سیکرٹریٹ میں تین سو روپے کا کلرک تھا۔ اپنے پانچ بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ تین سو روپیوں کو بڑی مشکل سے پندرہ دن تک چلا سکتا تھا۔ اس کے بعد ادھار یا خست

یا دنوں۔ وہ اس وقت دفتر کی فائلوں سے تقریباً اندھا ہو کر بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر سائیکل چلاتے ہوئے نئی دہلی سے سبزی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا اور اب نیا کے لئے گرم کپڑے آئیں گے جو چھ سال کی تھی اور پہلی بار اسکول جا رہی تھی۔ بڑا لڑکا گووند بی۔ اے پاس کر کے بے کار تھا۔ پھر بھی ہفتے میں دو بار سینما دیکھتا تھا۔ نندو کی ایک ٹانگ موٹر کے حادثے میں کٹ گئی تھی۔ اس لئے زندگی کے متعلق اس کا نظریہ بے حد تلخ ہو چکا تھا۔ وہ ہر ایک سے نفرت کرتا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بھی۔ پڑھنا بالکل بند تھا اور سب کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ مگر کھانا اور کپڑے اُسے بھی چاہیئے تھا۔ بڑی لڑکی کامنی میٹرک میں دو بار فیل ہو کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شادی کی فکر دن رات چوکھی اور اس کی بیوی سمتی کو کھائے جاتی تھی۔ مگر شادی کے لئے روپیہ درکار ہے۔

سڑک پر اس قدر بھیڑ تھی۔ تانگے، موٹریں، چھکڑے، ہاتھ گاڑیاں، رکشے، لاریاں، ٹرکیں، ویگن، کیچڑ، بدبُو سب۔ اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے اپنی خواہشوں کی بُو سونگھتے ہوئے چوہے اور چھچھوندر نما آدمی اپنی لمبی مقوتھنیاں لٹکائے ہوئے۔ چہرے پر خشونت، بیزاری، مایوسی، تھکن، غصہ، غم اور انتقام کی جھلکیاں لئے ہوئے ظالم، بے بس، مجبور، کمینے گالیاں دیتے ہوئے چہرے۔ رحم اور امید سے خالی، حسن اور شاعری سے عاری پھول اور چاندنی سے ناآشنا، ان سے کچھ کی بات نہ کرنا۔ پتھر سے مار دیں گے۔ صرف ان کی سورتیں دیکھ اور ان کی پسلیاں اور گھٹنے کی بے ہنگم ہڈی اور آنتیں۔ ٹیڑھی میڑھی پرانی ادوائن کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی چوکھی کو ان لوگوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جیسے یہ لوگ کسی دوسری دنیا کے آئے ہوئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کی بیوی ہر روز اس کی قمیض کا کالر صاف کر دیتی تھی۔ کیچڑ میں کلبلاتے ہوئے ان کیڑوں سے چوکھی کو سخت نفرت تھی۔ مگر آج اس کا جی کچھ یوں چاہتا تھا کہ وہ بھی اس بھیڑ میں گم ہو جائے۔ آنکھیں

بند کر کے قطب روڈ پر چلتا ہوا خود بخود کسی ٹرک کے نیچے آجائے۔ کیوں کہ آج اسے اپنے دفتر میں دو گھنٹے مزید بیٹھ کر کام کرنا پڑا تھا اور بھوک کا یہ عالم تھا کہ آنتیں اس رسّے کی طرح تن رہی تھی۔ جسے دو مخالف سمتوں سے کھینچا جائے۔ عجب حالت تھی بھوک سے اُس کی۔

وہ امرتسری مٹن شاپ کے قریب سے اپنا سائیکل چلاتا ہوا گزرا۔ دفتر سے واپس آتے ہوئے یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ یوں اچھی اچھی دکانوں کے قریب سے گزرنا۔

امرتسری مٹن شاپ میں دہکتے ہوئے سُرخ انگاروں کے اوپر بھوری بھوری چاپیں تلی جا رہی تھیں اور تکّے سیخ پر اُلٹے جا رہے تھے اور چٹ پٹے کباب سُرخ ہو رہے تھے۔ دو موٹریں دکان کے باہر کھڑی تھیں اور کونے میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں بھنے ہوئے تندوری مرغ اور بام فریٹ مچھلی کھا رہے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھوک سے پاگل ہو جائے گا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سائیکل کو آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک ہاتھ گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہاتھ گاڑی میں پھل لدے ہوئے تھے۔ چمن کے انگور، قندھار کے انار، اور کشمیر کے سیب اور ناشپاتیاں۔ وہ کو لوگ ہیں جو انہیں کھاتے ہیں۔

ہاتھ گاڑی والے نے ایک موٹی گالی اسے دی اور دیکھ کر چلنے کے لئے کہا۔ کیوں کہ اس طرح بلاوجہ ٹکرانے سے انگوروں کی ایک ٹوکری ہاتھ گاڑی سے اُلٹ کر نیچے سڑک پر جا گری تھی۔

پیشتر اس کے کہ ٹریفک کا سپاہی آتا اور لوگ اکٹھے ہوتے چوکھی منہ ہی منہ میں معافی نامہ بُدبُدا کر سائیکل کو زور سے چلا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

گھر گھر جانے کا راستہ جگہ جگہ لالچ اور ترغیب سے بھرا ہوا تھا۔

امرتسری مٹن شاپ کے آگے کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر دل بہار ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں گرم گرم پوریوں کے ساتھ آلو چھولے ملتے ہیں اور برف میں لگی ہوئی ٹھنڈی رس ملائی اور پنیر میٹر کا

پلاؤ اور بین میں تلی ہوئی کنول ڈنڈیاں آدمی جب بھوکا ہو یہ سب چیزیں جنت کی نعمتوں سے بھی اعلیٰ معلوم ہوتی ہیں اس سے دو گز کے فاصلے پر بازار میں امراؤ سنگھ حلوائی کی دکان تھی جو مصالحے پوریوں کے ساتھ آلو کی بھاجی اور کھٹے کدو کی ترکاری دیتا تھا جسے کھا کر اور دو امرتیاں پھانک کر اوپر سے تازہ عمدہ دہی کا ایک گلاس پی کر آدمی سورگ میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر آج بائیس تاریخ ہے اور چوکھی کی جیب میں صرف دو آنے ہیں۔

ہر گام پر چوکھی کی بیزاری بڑھتی گئی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے گھر تک پہنچا جو ایک تنگ و تاریک گلی کے آخری سرے پر واقع تھا۔ دروازے پر پہنچ کر جب اس نے زور سے اپنی سائیکل کی گھنٹی بجائی تو سمتی نے کنڈی کھول دی۔ اس نے آج اپنے بال بڑی احتیاط سے بنائے تھے اور لیموں رنگ کی سوتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ جو چوکھی کو بہت پسند تھی اور اس کے چہرے پر ایسی شادابی مسکراہٹ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی کسی لال کاغذ کو کاٹ کر اس کے ہونٹوں پر چپکا لی گئی ہے۔ یہ سارا ڈھونگ سمتی نے اس لئے کیا تھا کہ آج وہ اپنے خاوند سے لیموں رنگ ساڑھی کے ساتھ چلنے والا ایک بلاؤز مانگنے والی تھی۔

تھکن سے چور ہانپتے ہوئے چوکھی نے سائیکل گھر کے آنگن میں ڈال دی۔

اس کی بیوی نے پوچھا "اتنی دیر کہاں رہے؟"

"دفتر!" چوکھی نے گرج کر جواب دیا۔

سمتی سہم گئی۔ چھوٹی لڑکی منیا جو دھیرے دھیرے اپنے باپ کی طرف قدم بڑھا کر آ رہی تھی دیوار سے لگ کر ساکت ہو گئی۔ سمتی نے سوچا آج بلاؤز نہیں ملے گا۔

"کھانا تیار ہے؟" چوکھی نے سائیکل کو تالا لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تیار ہے۔"

"کیا پکا ہے ؟"

"ماش کی دال ہے۔ ڈالڈے میں بگھار کے پکائی ہے۔ تم چکھ کے دیکھو بہت عمدہ پکی ہے۔"

"اور ؟"

"اور ؟ — روٹی ہے۔"

"اور ؟" چوکھی پھر گرجا اور دل ہی دل میں اس کا خون اُبلنے لگا۔

کبھی کچھ اور نہیں ملتا۔ جب دیکھو دال اور روٹی۔ روٹی اور دال۔ کبھی ماش کی دال۔ کبھی مسور کی۔ کبھی مونگ کی، کبھی ارہر کی۔ کبھی چنے کی۔ کبھی سڑا سا ساگ یا گلی بھنڈی جسے کتے بھی نہ کھائیں مگر آج تو وہ بھی نہیں۔ صرف دال دال دال.... آخری چند دنوں میں مہینے کے آخری روز دال پکتی ہے اور صرف دال ہی کیوں پکتی ہے ؟ ایک کٹوری دال کھاؤ۔ دو چپاتیاں نگلو، ٹھنڈا پانی پیو اور سو جاؤ۔

"روز دال روٹی، روز دال روٹی، روز دال روٹی، وہ سائیکل چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر زور سے چلّایا۔ پھر اس نے اپنی سائیکل کو زور سے ٹھوکر ماری اور بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کھانے کو کیا ہے ؟" چوکھی نے ہل اپنے کندھے سے اتار کر لکڑی کے ایک کھمبے سے اُسے ٹکاتے ہوئے اپنی بیوی سُمتی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے !"

"کچھ نہیں ہے ؟" چوکھی نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے !" سُمتی نے اسی کامل قطعیت سے جواب دیا "جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اور آسمان ختم ہو جاتا ہے، امیدوں کے کتے رسیاں تڑا کر بھاگ جاتے ہیں اور آنے والے خدشے

خون آشام چمگادڑوں کی طرح گھر کے کونے کھدروں میں پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور نگاہوں میں قبرستان کھلنے لگتے ہیں۔"

"تو بالکل کچھ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔؟" رُک رُک کر پھر جُوکھی نے پوچھا - حالاں کہ اُسے معلوم تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھی بھوک کی شدت اس کی زبان پر ایک ہی سوال لا رہی تھی۔ اس بار جُوکھو نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"کیوں نہیں ہے ؟" بے معنی سا سوال کیا اس نے۔ سمتی کے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ آگئی۔ کبھی سمتی بہت خوبصورت تھی۔ اب تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ رات اور دن سمتی کے دل پر بھی یہی سوال آتا تھا مگر اس کا جواب اسے آج تک نہیں سوجھا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک اَن پڑھ، گنوار، معصوم، سادہ لوح کسان کی طرح اَن پڑھ سادہ لوح بیوی تھی۔ اس لئے یہ سوال اس کے دماغ کے پنجرے میں پھڑ پھڑا کے رہ گیا۔

"تو راؤ کے گھر سے مانگ لاؤ۔"

"اس کے گھر میں بھی فاقہ ہے۔"

"تو محمد کے گھر ہی سے ۔ ۔ ۔" فقرہ اس سے پورا نہ ہوا کیونکہ وہ پرانے خیال کا تھا۔ چھوت چھات کرتا تھا اور مسلمانوں کے ہاتھ کا نہیں کھاتا تھا۔

"محمد کے گھر میں بھی فاقہ ہے۔"

اس کے دیش کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ وہی ملک ہے، وہی دیش وہی زمین ہے جو سونا اگلتی تھی۔ آج دو دانے گندم کے نہیں اگا سکتی۔ جو رگھاٹ سے چار میل پرے تریتا ندی بہتی ہے۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی۔ پانی جو زمین، بیج اور ہرے پتوں کا ساتھی ہے کتنی دفعہ اسکیمیں بنیں مگر تریتا ندی قریب میں بہتی رہی اور کھیت پانی کے لئے ترستے رہے۔ سُنہ

ی کاغذ پر ایک لہر بنی تھی، تریناندی سے اس کے کھیت تک۔ وہ کاغذ تک ہی رہی..... دو سال ہوئے نہر کا کام بھی شروع ہوا مگر ٹھیکیدار روپے مار کے کہیں چلا گیا۔ تین سو گز تک نہر کھدی ہے۔ آگے پھر وہی بنجر علاقہ ہے..... ہائے رام! چاروں طرف کیسی سخت بے رحمی کا سوگ چھایا ہے۔

یہ سب باتیں وہ جانتا تھا اور بھی بہت سی باتیں۔ جنہوں نے اس کے دل کی ساری خوبصورتی شاعری، سنگیت، خواب، سپنے، جذبے، احساس اور حیات ختم کر دیئے تھے۔ بس ان سب کے اوپر ایک ہی احساس غالب تھا۔ وہ بھوکا ہے، وہ بھوکا ہے۔

جوگھات میں رات ہو چکی تھی۔ پھوس کے چھتے ہوئے برآمدے میں اس کے گھر میں بانس کے کھمبوں سے لگے ہوئے اس کے گھر کے افراد مایوسی اور تاریکی کے دلدل میں پھنسے ہوئے کھڑے تھے کوئی روشنی، کوئی جدوجہد، نئی زندگی کی کوئی لہر ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ وہ اپنی بھوکی آنتوں کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنی کیچڑ بھری دلدلی آنکھوں سے ایک ختم نہ ہونے والے خلا میں تک رہے تھے۔ یہ اس کی بیوی سمتی تھی۔ وہ اس کا لڑکا گووند۔ وہ دیوار سے لگا ہوا نندو۔ وہ منیا چھ سال کی معصوم بچی..... کامنی جا چکی تھی۔

چھ ماہ ہوئے اس نے تیرہ برس کی کامنی کو گاؤں کے بنئے کے ہاں ساڑھے چار سو میں فروخت کر دیا تھا۔ اس رقم سے اب تک گھر چلا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس نے اپنی زمین کا بہترین ٹکڑا اس بنئے کے ہاں گروی رکھ دیا تھا، نو سو روپے میں۔ اب اس کے پاس بیچنے کو کچھ نہیں تھا۔ چھ ماہ پہلے بنئے نے کامنی کو خرید لیا تھا۔ تو اس پر ترس کھا کر وہ منیا کو بھی لینے پر تیار ہو گیا تھا۔ گو منیا کی عمر ابھی چھ سال کی تھی مگر اس کے نین نقش کامنی سے بھی اچھے تھے۔

"پچھتر روپے اس کے بھی دے دوں گا۔" بنئے نے اس سے کہا تھا۔

"پچھتر روپے؟"

چوکھی نے چاروں طرف دیکھا ۔ سمتی بانس کے کھمبے کے پیچھے منہ چھپائے ہوئے ۔ ننددولوا سے لگا ہوا اپنے باپ سے منہ موڑ کر ، گود ند فرش پر بیٹھا ہوا گھاس کے تنکے توڑتا ہوا ۔ دبلے پتے بھوکے ڈھانچے ۔ سب کے سب جانوروں کی طرح بھوکے اور خشمگیں .....

چوکھی نے مُنیا کی طرف قدم بڑھایا ۔

" نہیں نہیں !" سمتی زور سے چیخی ۔

چوکھی نے مُنیا کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا ۔ مُنیا سہم کر سسکنے لگی ۔

" نہیں نہیں ایسا مت کرو " سمتی نے آکر دونوں ہاتھوں سے چوکھی کے پاؤں پکڑ لئے ان پر اپنا سر رکھ دیا اور گڑگڑا کر رونے لگی " اسے مت بیچو ۔ اسے مت بیچو ۔ مجھے بیچ دو ، اسے مت بیچو "

چوکھی نے غصے میں آکر سمتی کو زور سے ایک لات ماری ۔ سمتی لڑکھڑا کر پرے جا گری ۔

چوکھی مُنیا کو لے کر گھر سے باہر نکل گیا ۔

جور گھاٹ کی اس رات میں کامل سناٹا تھا ۔ زمین بنجر تھی اور آسمان گداگر کے خالی پیالے کی طرح اوندھا پڑا تھا اور اگر کہیں کوئی خدا تھا تو اس نے بھی شرم سے منہ چھپا لیا تھا ۔ ایسی بھیانک بے انت بے چھور رات کے تاریک سایوں میں ایک بھوکا کسان اپنی چھ سالہ بچی کا ہاتھ پکڑے ، پتھریلی پگڈنڈی پر خاموشی سے روتا ہوا چلا جا رہا تھا !!!

چوراہے کا کنواں

میرا بچہ بیمار تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مر رہا ہے۔

لوگوں نے کہا: "اگر تم اسے چوراہے کے کنویں پر لے جاؤ اور اس کنویں کا ایک گھونٹ پانی اس کے حلق میں اُتار دو تو تمہارا بیٹا بچ جائے گا۔"

میں نے پوچھا: "چوراہے کا کنواں کہاں ہے؟"

وہ بولے: "کہیں نہیں گاؤں میں ہے۔"

"کہیں نہیں گاؤں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

ہمارے گاؤں کے سب سے بڈھے دیدنے کہا۔

"تم یہاں سے وہاں جاؤ۔ وہاں سے جہاں جاؤ۔ جہاں سے تہاں جاؤ۔ اور جب تم تہاں پہنچو گے تو وہاں سے کہاں کو مڑ جاؤ۔ بالکل سامنے تمہیں کہیں نہیں گاؤں ملے گا۔ اس کے وسط

میں چوراہے کا کنواں ہے!"

میں نے وئید کا شکریہ ادا کیا۔ بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنے گاؤں سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

میں یہاں سے وہاں گیا۔ وہاں سے جہاں گیا۔ جہاں سے تہاں گیا۔ اور تہاں پہنچ کر جب میں کہاں کو مڑا تو مجھے اپنے سامنے چار سڑکیں نظر آئیں۔

ایک لال سڑک تھی۔

ایک نیلی سڑک تھی۔

ایک کالی سڑک تھی۔

ایک سفید سڑک تھی۔

اور ان چاروں سڑکوں کو کاٹتے ہوئے دائرے کی شکل میں کہیں نہیں گاؤں آباد تھا اور اس کے وسط میں چوراہے کا کنواں تھا۔

چوراہے کے کنویں پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ مرد اور عورتیں، بڈھے اور بچے۔ ایک میلہ سا لگا تھا۔ اور ان لوگوں میں ایک دراز قد، سپید ریش بڈھا اِدھر اُدھر گھومتا ہوا اور پر وقار معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کی تعظیم دے رہا تھا۔ اور بے حد وجیہہ بڈھا تعظیم لیتے ہوئے بڑے شاعرانہ انداز میں اپنی بانہوں کو اوپر نیچے گھماتا تھا۔ ایسی شاعری جو صرف پھلدار شاخوں میں ہوتی ہے۔

بڈھے نے مجھ سے پوچھا: "تم اس گاؤں میں اجنبی ہو؟"

میں نے تعظیماً سر جھکا دیا۔

بڈھے نے پوچھا: "تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں یہیں کہیں گاؤں سے آیا ہوں۔ میرا بچہ بیمار ہے اور وئید جی نے کہا ہے اگر میں اپنے بچے کو چوراہے کے کنویں کا ایک گھونٹ پانی پلا دوں تو میرا بچہ بچ جائے گا!"

"پانی سے کیا ہوگا۔؟ بڈھے نے بڑے مایوس لہجے میں پوچھا۔

"پانی میں بڑی طاقت ہے بابا!"

"آگ میں بڑی طاقت ہے بیٹے!"

"آگ اور پانی دونوں ہی بڑی طاقتیں ہیں بابا۔ آگ جو انسان کے دل کے اندر ہے۔ پانی جو اس کی آنکھ میں ہے۔ جس کام کو آگ پورا نہیں کرسکتی اُسے پانی پورا کردیتا ہے۔ ایسا وحید جی نے کہا تھا۔"

بڈھا میری بات سن کر مسکرایا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "تمہارے گاؤں کا وحید بڑا سمجھدار معلوم ہوتا ہے، مگر افسوس! اس وقت تمہیں اس کنویں سے ایک بوند پانی نہیں مل سکتا۔"

"کیوں؟"

"دیکھتے نہیں ہو؟ ہم کنواں صاف کر رہے ہیں۔"

یکایک عین اُسی وقت ایک غوطہ خور نے باہر نکل کر جال کو کنویں کے باہر الٹ دیا۔ جال سے بہت سا کیچڑ زمین پر بکھر گیا۔ اکدم بہت سے لوگ دوڑ پڑے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کیچڑ میں کچھ ٹٹولنے لگے۔ مگر انہیں کیچڑ میں سے کچھ نہ ملا۔ غوطہ خور نے خالی جال کو ہاتھ میں لے کر پھر کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

"یہ غوطہ خور کیا ڈھونڈ رہا ہے؟" میں نے بڈھے سے پوچھا۔

"کچھ ڈھونڈ نہیں رہا ہے۔" بڈھے نے جواب دیا۔

"یہ کنویں کا گندہ کیچڑ باہر نکال کے پھینک رہا ہے۔ جب سارا کیچڑ باہر نکل آئے گا تو یہ کنواں صاف ہو جائے گا۔ پھر تم اس کا پانی اپنے بچے کو پلا سکتے ہو!"

میں بچے کو لئے ہوئے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ غوطہ خور جال کو لئے ہوئے باہر نکلا۔ اُس نے

کیچڑ نیچے زمین پر بکھیر دیا۔ کیچڑ میں سے ایک کنگھی نکلی۔

غوطہ خور نے پوچھا: "یہ کنگھی کس کی ہے؟"

ایک نوبیاہتا لڑکی نے شرما کر غوطہ مار کے ہاتھ سے کنگھی لے لی اور پھر اپنے شوہر کے کندھے پر جھک گئی۔ اس لڑکی کے بال سنہرے اور لانبے تھے۔ چہرہ بیضوی اور گیہواں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بھوری۔ کبھی کبھی جب ان میں آنسو آجاتے تو وہ شفق کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔

"یاد ہے؟" وہ اپنے شوہر سے آہستہ سے بولی اور اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے کنگھی پر پھرنے لگیں، جیسے کنگھی کا ہر وندانہ وقت کا ایک شیریں لمحہ ہو جو اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

"یاد ہے!" اس کے جوان شوہر نے آہستہ سے کہا اور وہ خوابوں میں کھو گیا۔

اسی کنویں کے کنارے اس نے اپنی شرمیلی کو پہلی بار دیکھا تھا جب وہ غسل کرنے سے پہلے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پیاسا تھا اور اس نے اپنا گھوڑا اس کنویں پر روک کر اس سے پانی مانگا تھا۔

پانی!

پانی میں بڑی طاقت ہے!

پانی میں بڑی محبت ہے!

جوان شوہر نے اپنی نوبیاہتا بیوی سے کنگھی لے کر اُسے ہونٹوں سے لگایا۔ پھر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا.... لڑکی نے اُسے پانی پلانے سے پہلے کنگھی کنویں کی جگت پر رکھ دی تھی۔ اس کے سنہرے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔ اور جب وہ پانی پلا کر پلٹی تھی تو نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسی کشمکش میں کنگھی اُچھل کر کنویں میں جا گری تھی!

یاد ہے؟

لمس کو یاد نہ ہوگا؟ ہاتھوں کا وہ پہلا لمس جب کنگھی پانی میں گر گئی تھی، جب نگاہ دل میں اُتر گئی تھی، جب بالوں کی ہر کرن آفتاب بن گئی تھی!

کسے یاد نہ ہوگا؟

غوطہ خور پھر باہر نکلا۔ باہر نکل کر پھر اس نے جال اُلٹ دیا۔ اب کے اس میں سے ایک لمبی سی چھری نکلی۔

پسیدریش بڈھے نے چھری کو ہاتھ میں لے کر پوچھا: "یہ چھری کس کی ہے؟"

چند لمحوں کے لئے اس مجمع میں سے کوئی نہ بولا۔ سب اس چھری کو جانتے تھے۔ اس چھری کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور بے حد خوبصورت تھا۔ یہ چھری جس نوجوان کی تھی وہ بھی اس مجمع میں کھڑا تھا اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا اُس نے اُس ظالم تھانیدار کو ختم کر دیا تھا جو ان کے گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت کے درپے رہتا تھا۔ مگر اُس نوجوان کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا اور پولیس کا مقدمہ خارج ہو گیا تھا؛ اور جس نے گاؤں کی عزت لی تھی اُس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا۔ پانی کی لہروں نے اس چھری کو اس طرح لوگوں کی نظروں سے نہاں کر دیا تھا جس طرح ماں اپنے گناہ گار بیٹے کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔

پانی میں بڑی طاقت ہے!

پانی جو انتقام ہے!

اس نوجوان کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ یکایک اُس نے آگے بڑھ کر بڈھے پسیدریش ہاتھ سے چھری اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے کمر بند میں اڑس لی اور فخر اور غرور سے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

غوطہ خور پھر جال باہر لایا۔ اب کے سیاہ رنگ کے کیچڑ میں ہاتھی دانت کی بہت سی چوڑیاں تھیں۔ گاؤں کی سب سے نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی، کیونکہ شادی کے روز ہی اُس کے دولہا نے زہر کھا لیا تھا؛ اور اس کے دولہا نے اس لئے زہر کھا لیا تھا کہ اُسے کسی دوسرے گاؤں کی لڑکی سے محبت تھی۔ وہ لڑکی جو کبھی اس کی نہ ہو سکی۔ سہاگ رات کو اپنے سامنے اپنے شوہر کی لاش دیکھ کر وہ لیلی اور شرمیلی چیخ کر باہر بھاگ گئی تھی اور اس نے اپنی ساری چوڑیاں اتار کر کنویں میں پھینک دی تھیں۔

بڈھا خاموش کھڑا رہا.....

اب وہ نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جھک کر ایک ایک چوڑی کو بڑی احتیاط سے اپنے دامن میں سمیٹنے لگی، جیسے وہ اپنی چوڑیاں نہیں اپنی نادیدہ حسرتیں چن رہی ہو۔ سب چوڑیاں اٹھا کے اس نے اپنے دامن میں ڈال لیں اور پھر سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک لوگ خاموش کھڑے رہے۔

بڈھے سے کہا: "یہ ہمارے پرکھوں کا کنواں ہے۔ یہ ہمیں زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی۔ اس کنویں سے کوئی نہیں بچ سکتا!"

یکایک غوطہ خور پھر باہر نکلا۔ اب کے اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا اور سینہ زور زور سے حرکت کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت نیچے، گہرے اتھاہ پانیوں سے کچھ ڈھونڈ کے لایا ہے.....

غوطہ خور نے بڑی احتیاط سے جال کو کھولا۔ اب کے جال میں کیچڑ کم تھا، ریت زیادہ تھی اور اس ریت میں ایک ننھے بچے کی لاش تھی!

یکایک سب لوگ دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور غور سے اس بچے کی لاش کو دیکھنے لگے۔

اُن سب کی نگاہیں متوحش اور پھٹی پھٹی سی تھیں۔

سپید ریش بڈھے نے اُس مردہ بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اوپر اُٹھا لیا اور بولا:۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

کوئی نہیں بولا۔

کوئی نہیں آگے بڑھا۔

مردوں کے چہرے فق تھے۔ شادی شدہ عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لئے تھے۔ نوجوان کنواریوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟ بڈھے سپید ریش نے درشت لہجے میں پھر پوچھا۔

سب دم بخود، چپ چاپ کنویں کے گرد حلقہ باندھ کھڑے تھے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی نے اس بچے کو اپنا نہ کہا۔

بڈھے نے مردہ بچے کو غوطہ خور کے حوالے کرتے ہوئے بڑے افسوس سے کہا:۔

"غوطہ خور اس بچے کو واپس کنویں میں ڈال دو۔"

پھر وہ میری طرف تاسف آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اجنبی! مجھے بے حد افسوس ہے کہ اب یہ کنواں صاف نہ ہو سکے گا۔ تم اپنے بچے کو اس کا پانی پلا کر اسے زندگی نہ دے سکو گے..."

غوطہ خور نے مردہ بچے کو واپس کنویں میں ڈال دیا۔

یکایک میری گود سے میرا بچہ اُچھل کر کنویں کی طرف چیختا ہوا بھاگا: "ٹھہرو! ٹھہرو! میں اس بچے سے کھیلوں گا!"

اور پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھوں میرے بچے نے کنویں میں چھلانگ لگا دی!

"میرا بچہ! میرا بچہ!" کہتے ہوئے میں آگے بڑھا۔ مگر گاؤں کے لوگوں نے مجھے روک دیا۔

"دیکھتے نہیں ہو! میں نے جھلا کر کہا، "میرا بچہ اس کنویں میں گیا ہے!"

"وہ اس دوسرے بچے سے کھیل رہا ہے!" سپید ریش بڈھا آہستہ سے بولا۔

میں نے کنویں میں جھانک کر کہا: "بیٹا! بیٹا! واپس آجاؤ۔"

کنویں سے ایک زہر خند ہنسی کی آواز آئی جیسے کنویں میں پانی نہ ہو زہر کا جھاگ ہو جو اس کنویں سے اُبل کر ساری دنیا کی وادیوں، گھاٹیوں اور میدانوں میں پھیل رہا ہو!

لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر پرے لے گئے۔ میں نے دو زانو ہو کر بڈھے کے دامن کو پکڑ لیا اور گڑگڑا کر بولا:۔

"میرا بچہ! بابا میرا بچہ مجھے واپس دے دو! میں خود چل کر تیرے کنویں کے پاس آیا ہوں۔ میرا بچہ مجھے واپس مل جائے!"

"مل جائے گا!" بابا سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی آ گئی۔ دھیرے دھیرے لیکن بڑی مضبوطی سے وہ بولا: "تیرا بچہ تجھے واپس مل جائے گا۔ لیکن اُسی وقت جب کوئی کنواری اس کنویں پر آئے گی اور اس کنویں کی جگت پر جھک کر اُس دوسرے بچے کو آواز دے گی اور اُسے اپنا بیٹا کہہ کر پکارے گی، اُسی لمحے تمہیں تمہارا بچہ مل جائے گا!"

میں وہاں سے اُٹھا اور گاؤں کی عورتوں کے پاس گیا۔

"میرا بچہ مجھے دے دو!"

شادی شدہ عورتوں نے اپنے گھونگھٹ لمبے کر لئے اور میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئیں ــــ

"میرا بچہ مجھے دے دو۔"

بڈھی عورتیں حقارت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ وہ حقارت سے ہنس سکتی تھیں، کیونکہ

اُن کی کوکھ اندھی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تاکہ وہ لوگ میرے رخساروں پر میرے گرتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

بہت دیر کے بعد جب میں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹائے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں گاؤں میں اکیلا ہوں جو کہیں نہیں ہے۔ اُس کنویں کے کنارے کھڑا ہوں جو ہر رات پر ہے اور اُس کنواری کا انتظار کر رہا ہوں جو ایک دن میرے بچے کی جان بچانے کے لئے اُس کنویں پر آئے گی۔!

اجنبی آنکھیں

اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں بہت عجیب تھیں جیسے اُس کا سارا چہرہ اس کا اپنا ہو۔ اور آنکھیں کسی دوسرے کی ہوں۔ اور اس کے چہرے پر لاکے پپوٹوں کے پیچھے محصور کر دی گئی ہوں اُس کی چھوٹی نوک دار ٹھوڑی، پچکے ہوئے ہونٹ اور چوڑے چوڑے کلوں کے اوپر دو بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں کچھ عجیب سی لگتی تھیں۔ پورا چہرہ ایک چالاک، ذہین، شاطر، خود غرض کمینے آدمی کا چہرہ تھا ___ ایسا چہرہ جو پینتیس برس کے بعد اکثر ان انسانوں کے ہاں ملتا ہے جنہیں ان حالات سے گزرنے کا موقع ملتا ہے جن میں سے آج کل کے بیشتر انسان گزرتے ہیں اور ایک ہی سا چہرہ لے کر روز رات کو اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ اس لئے مجھے اس کی آنکھوں سے بڑی دل چسپی پیدا ہو گئی معلوم نہیں کہاں سے چرائی ہیں ظالم نے یہ آنکھیں۔

میں اس کی دوکان پر ایک بش شرٹ سلوانے گیا تھا۔ کولون میں اسکی کپڑوں کی بہت بڑی

دوکان تھی۔ باہر بورڈ لگا تھا "یہاں سوٹ چوبیس گھنٹے میں تیار کیا جاتا ہے۔" اس بورڈ نے مجھے اس کی دوکان کے اندر جانے پر مائل کیا۔ ایک تو یہ وجہ تھی۔ اور دوسری وجہ اس کا نام تھا جو باہر سائن بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا "پروپرائٹر بی۔ ڈی۔ ایرانی"

وہ بی۔ ڈی۔ ایرانی تھا، بی جی۔ ڈی۔ ایرانی۔ ناموں کی مماثلت نے مجھے اس دوکان کے اندر جانے پر مجبور کیا۔

وہ سانولی بیک ٹیری لین کا ایک عمدہ سوٹ پہنے، منہ میں ایک لمبا سگار دابے، ہاتھوں پر ہیرے کی دو انگوٹھیاں پہنے بڑھیا تمباکو کا خوش گوار دھواں چھوڑتے ہوئے اپنی کشادہ دوکان میں ادھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔ پہلے تو اس نے میرا کوئی خیال نہیں کیا۔ لیکن آرڈر لیتے وقت جب اُس نے میرا نام معلوم کیا تو خوشی سے چونک پڑا۔ ہم دونوں سندھی تھے اور ایک ہی ذات والے تھے اور یہ ہانگ کانگ تھا۔ وطن سے اس قدر دُور چند منٹوں ہی میں ہم ایک دوسرے سے گھل مل گئے جیسے برسوں کے دوست ہوں۔ اس نے مجھے رات کے کھانے کے لئے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ پھر میں نے اپنی ایک تکلیف بھی اس سے بیان کی۔

میں کینٹھ ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ بامبے آبزرور کے نمائندے کی حیثیت سے ہانگ کانگ آیا تھا۔ یہ ہوٹل ایک سستے قسم کا ہوٹل تھا۔ مگر اتنا سستا بھی نہیں تھا کہ چھوکریاں سپلائی کرتا ہو۔ ایک روز رات کو دو بجے کے قریب میں ایک نائٹ کلب سے کیبرے دیکھ کر لوٹا تو معلوم ہوا کہ کینٹھ ہوٹل کے آٹھ دس کمروں میں ایک ساتھ چوری ہو گئی ہے۔ بدقسمتی سے ان میں میرا کمرہ بھی شامل تھا۔ میرے دونوں سوٹ کیس چوری ہو گئے تھے اور ایک ٹائپ رائٹر بھی۔ پولیس تحقیقات کر رہی تھی اور کرے گی اور کرتی رہے گی۔ مگر مجھے دو دن بعد بامبے لوٹنا تھا۔ آبزرور کے ایڈیٹر نے فوراً واپس آنے کے لئے کیبل کیا تھا۔ کیونکہ ہانگ کانگ میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب مجھے بمبئی پہنچ

کر وہاں سے پھر فوراً ہی نیرو بی جانا تھا۔

"مجھے کچھ رقم چاہیئے۔" میں نے بی۔ ڈی۔ ایرانی سے کہا۔ "مگر میں اب اس کے عوض صرف اپنا چیک پیش کر سکتا ہوں۔ وہ بھی ہندوستان کے بینک کا۔

"کتنی رقم چاہیئے؟" اُس نے پوچھا۔

"پانچ سو روپے!"

"ضرور۔" بی۔ ڈی۔ ایرانی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "میرے ساتھ چلو۔ میں ابھی بینک سے اپنی گارنٹی پر آپ کا چیک کیش کرائے دیتا ہوں۔ یا خود رقم دے دوں گا۔ یہاں ہم سندھیوں کا اپنا ایک بینک ہے۔"

دی سندھی مرکنٹائل بینک ایک پانچ منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ بی۔ ڈی۔ ایرانی نے مجھے بتایا کہ بینک کی عمارت کا مالک خود بی۔ ڈی۔ ایرانی ہے۔ گیارہ ہزار روپیہ کرایہ ہر مہینے آتا ہے۔ اور وہ بینک کا ڈائرکٹر بھی ہے۔

پانچ سو روپے دلوا کر اس نے مجھ سے کہا۔ "شام کے چھ بجے میری دوکان پر آجانا۔ گھر جانے سے پہلے تھوڑا سا گھوم پھر لیں گے۔" میں شام کے ٹھیک چھ بجے اس کی دوکان پر پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔ دوکان کے ملازموں کو ہدایت دے کر وہ میرے ساتھ باہر نکلا۔ دوکان کے باہر بادامی رنگ کی ایک مرسڈیز کھڑی تھی۔ وہ موٹر بہت تیز چلا رہا تھا۔ مگر گاڑی کے بریک بہت عمدہ تھے۔ گو اس کا چہرہ چھوٹا تھا، مگر جسم بہت مضبوط تھا۔ خاص طور پر اس کے ہاتھ بڑے مضبوط اور بالوں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس خوبصورت سُوٹ کے اندر اُس کا جسم ضرور کسی بن مانس یا گوریلا کا رہا ہوگا۔

وہ راہ چلتے چلتے سیٹی بجاتا۔ کسی خوبصورت چینی لڑکی کے قریب جا کر اپنی تیز موٹر ایک دم

دھیمی کر کے اُس سے چینی زبان میں کچھ کہتا اور پھر ہنس کر آگے چل دیتا۔ اس کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت گندے فقرے کس رہا ہے۔

"کسی چینی لڑکی سے پٹے نہیں اب تک؟"

"یہاں کس میں ہمت ہے جو اسیرانی کو پیٹے۔ یہ گلی میری ہے۔"

"تمہاری کیسے ہے؟"

"اس گلی کے سب غنڈوں کو میں جانتا ہوں۔ یہاں میرے دو جوئے خانے چلتے ہیں۔ دیکھو گے؟"

"دیکھ لیں گے۔"

سامنے کراکری کی دوکان، پچھواڑے جوئے خانہ۔ دونوں کے درمیان ٹائلٹ کا ایک لمبا کمرہ جن کے اندر دو ادھیڑ عمر کے چینی چھوٹے چھوٹے تولیے لئے کھڑے رہتے تھے۔ وہ اسیرانی کو تو پہچانتے ہی تھے، اس لئے مجھے ٹائلٹ کے اُدھر جوئے خانے میں جانے کے لئے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر دوسرے گاہکوں کے لئے کوڈ ورڈ تھا۔ اس جوئے خانے میں وہی جا سکتا تھا جسے وہ خفیہ لفظ معلوم تھا۔ ورنہ بس ٹائلٹ میں پیشاب کرے اور واپس ہو جائے۔

"میں ہر کام بڑے اسٹائل سے کرتا ہوں۔" بی۔ ڈی۔ اسیرانی نے مجھے اپنا جوئے خانہ دکھاتے ہوئے کہا۔ عمدہ سجے ہوئے دس کمرے دبیز بے آواز غالیچے، خاموش مودب بیرے، نازک اندام چینی لڑکیاں جام پیش کرتے ہوئے۔ اور امیر گاہک۔

"یہاں ہائی کلاس جوا چلتا ہے۔ صرف گنے چنے گاہک یہاں آتے ہیں۔ روز رات کو ڈھائی ہزار کا کٹ مجھے یہاں سے ملتا ہے۔ باہر کراکری کی دوکان بھی اچھی چلتی ہے۔"

"ویری نائس پلیس" میں نے اُس سے کہا۔ "یہاں تو خلیفہ ہارون رشید کی طرح تالی بجانے کو جی چاہتا ہے۔

"کون خلیفہ؟" اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

اس کی آنکھیں مجھے اس وقت بڑی معصوم اور بھولی سی معلوم ہوئیں۔

"کچھ نہیں۔!" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "بامبے میں میرا ایک دوست ہے۔ وہ مجھے اس وقت یاد آ گیا۔ جب وہ کوئی اچھی جگہ دیکھتا ہے۔ تو تالی پیٹنے لگتا ہے۔"

"کیا بچپنا ہے!" اس نے مجھ سے کہا۔ اور ایک لمبا سگار اپنے منہ میں لے کر اُس کا خوش گوار دھواں میرے منہ پر پھینکنے لگا۔

"جوا کھیلو گے؟ اُس نے پوچھا۔

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ وہ مجھے جوئے خانے سے لے کر باہر آ گیا۔ دوسرا جوئے خانہ دکھا کے وہ مجھے ٹی ہاک اسٹریٹ میں لے گیا۔ یہاں بھی سب لوگ اسے جانتے تھے۔ اور ان کے چہروں سے لگتا تھا جیسے اس سے ڈرتے بھی ہوں۔ "یہاں میرا ایک چنڈو خانہ ہے۔" ایرانی نے مجھ سے کہا۔

"کیا ابھی تک اِدھر چنڈو خانے موجود ہیں؟ میں نے اس سے پوچھا۔

"ہانگ کانگ میں تو ہیں۔ اُدھر سنا ہے نہیں رہے۔" ایرانی نے منہ سے اپنا لمبا سگار نکال کے اُدھر دوسرے چین کی طرف اشارہ کیا۔

چنڈو خانے کی فضا مجھے بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اچھا انتظام تھا۔ ہشت پہلو چینی شمع دان، ہر پہلو پر رنگ دار جھالریں لٹکتی ہوئیں چھوٹے چھوٹے پیالوں میں انواع و اقسام کی منشیات اور دھواں اور ترچھے پپوٹوں والی حسینائیں جو نشہ نہیں کر سکتی تھیں نشہ لا سکتی تھیں، پیش نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ چنڈو خانہ بھی ہشت پہلو تھا۔ ہر کمرہ ایک مرکزی ہال میں نکلتا تھا۔ جس میں چند چینی سازندے بیٹھے تھے۔ اور ایک چینی رقاصہ گھوم گھوم کر ناچ رہی تھی۔ دو بڑے بڑے چینی پنکھے اس کے ہاتھ میں تھے۔ جن سے وہ کبھی کبھی ستر پوشی کا کام لیتی تھی ورنہ بالکل ننگی تھی۔

"میکاؤ سے منگائی ہے۔" اسرانی نے مجھے بتایا۔ "دو سو ڈالر روز پر۔ کیسی ہے؟"

"اچھی ہے!"

"ملوگے؟"

"نہیں!"

"تمہاری مرضی۔"

باہر آ کے ہم اُس کی مرسڈیز میں ٹھہر گئے۔ اُس نے مجھے بتایا۔ پورے کوٹون میں ٹی ہاک کا چنڈو خانہ سب سے بڑھیا ہے۔ رات کو پانچ سات ہزار ڈالر کی گاہکی ہوتی ہے۔ دن کو بھی دو ڈھائی ہزار کی گاہکی ہو جاتی ہے۔ ونڈر فل بزنس۔"

"اور کپڑے کی دوکان؟ میں نے پوچھا۔

"ارے وہ تو ایک سائن بورڈ ہے۔ وہاں سے کیا ملتا ہے۔ آج کل سیدھا دھندا کر کے کون جی سکتا ہے۔ یو آر اے ڈیم فل۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"اس میں کیا شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر وہ مجھے ایک قحبہ خانے میں لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ دراصل مجھے اپنی سلطنت دکھا رہا تھا۔ ایک غریب سندھی آج سے پینتیس برس پہلے دو سو ڈالر لیکر ہانگ کانگ میں آیا تھا۔ آج اُسی بی۔ ڈی۔ اسرانی کا شمار ہانگ کانگ کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔

"ایسے ایسے میرے چھ برانچیں ہیں۔" اس نے مجھے اپنا پہلا قحبہ خانہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "کوئی لڑکی پسند آئی؟"

"نہیں۔"

"کیا تم کو لڑکیاں پسند نہیں ہیں؟"

"ہیں تو سہی، مگر اپنے گھروں میں۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے پھر اُن حیرت زدہ معصوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا جو اس کی بڑی بڑی روشن اور سیال پتلیوں سے چھن کر آ رہی تھیں۔ اس لمحے میں وہ نگاہیں بہت پاکیزہ تھیں۔ اور سردیوں کی پہلی برف کی طرح میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ میں نے تشریح کرنا مناسب نہ سمجھا، اس لئے صرف اتنا کہا کہ میرے لئے ہانگ کانگ کے اور کلکتہ یا بمبئی کے قحبہ خانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اگر کوئی فرق ہے تو محض ظاہری سجاوٹ میں، یا پھر چہرے کی ظاہری ساخت میں۔ وہاں لڑکیاں ہندوستانی ہیں۔ یہاں چینی ہیں، اور کوئی فرق نہیں۔!"

"اوہ، میں سمجھ گیا، تم کو فارن مال پسند ہے۔ ایمبیسی روڈ پر جو میرا برانچ ہے اس میں فارن مال بھی ملتا ہے۔ اور بہت کم کے بہت اچھا ملتا ہے۔ میں ابھی تم کو اُدھر لے چلتا ہوں۔ ادھر ایک نئی چھوکری آئی ہے، اس کو ذرا دیکھ لو۔"

اسرانی نے قحبہ خانہ کے مہتمم سے چینی میں کچھ بات کی۔ وہ لوگ ہمیں ایک نیم تاریک کمرے میں لے گئے، جہاں ایک چینی لڑکی ہاتھ پاؤں سے بندھی صوفے پر رکھی تھی۔ اسرانی کے کہنے پر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے تھے۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ اسرانی چند منٹ تک اُسے چینی زبان میں کچھ سمجھاتا رہا۔ مگر وہ لڑکی برابر سر ہلا کر انکار کرتی رہی اور آخر میں چیخنے لگی۔ اور کمرے سے بھاگ جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس پر اسرانی نے گھونسا مار کر اس لڑکی کو نیچے گرا دیا۔ لڑکی کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور وہ فرش پر پڑی پڑی سسکنے لگی۔ اور دہشت زدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اسرانی مجھے لے کر آ گیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر کے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ کل ہی تائی وان سے چھ لڑکیوں کا ایک بیچ منگوایا ہے۔ قحبہ خانے میں ہر دوسرے تیسرے مہینے نئی لڑکیاں منگانی پڑتی ہیں۔ ورنہ بزنس ڈل پڑ جاتا ہے۔ بالکل نئی چھوکریاں

ہیں۔ اغوا کر کے لائی گئی ہیں۔ اس لئے دھندا بالکل نہیں جانتیں۔ ایک دم اناڑی ہیں حرامزادیاں۔"

"اے چھنے!" اس نے ایک لمبے تڑنگے ہندوستانی کو آواز دی جو لباس اور وضع قطع سے اس قحبہ خانہ کا کوئی اہم ملازم معلوم ہوتا تھا۔

چھنے نے قریب آ کر مودب سلام کیا۔ "اس پر دس آدمی چھوڑ دو۔" ایرانی نے اندر کمرے میں بند چینی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

چھنے نے اِدھر اُدھر آوازیں دیں۔ تھوڑی دیر میں کمرے کے باہر آٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ ایرانی نے سب کو لائن میں کھڑا کر کے کیو بنا دیا اور ضروری ہدایات دے کر وہاں سے مجھے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پیچھے کمرے سے لڑکی کی چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" یکایک میں برداشت نہ کر سکا۔

"تاکہ شرم باقی نہ رہے۔" اس نے مجھے بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ "جب تک لڑکی مکمل طور پر بے حیا نہ ہو گی ہمارے کس کام کی؟"

اُس کا گھر بہت عمدہ تھا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی ڈھلوان پر واقع تھا۔ وہاں سے ہانگ کانگ کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ اُس کی بیوی بہت ہی گھریلو اور سیدھی سادی عورت تھی۔ دو بچیاں تھیں۔ بڑی پیاری اور معصوم۔ ایک دس سال کی ہو گی، دوسری کوئی بارہ تیرہ برس کی۔ اس نے مجھے بتایا۔ سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کا خاوند جنوبی امریکہ میں بہت بڑا دھندا ہے اس کا۔ میری لڑکی کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔"

"لڑکا کوئی نہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"لڑکا نہ ہووے تو کمتی کیسے ہووے۔" وہ زور سے ہنسا۔ "دو لڑکے ہیں۔ مگر دونوں سیانے ہیں۔ عمر کے بڑے ہیں۔ ایک کو فلپائن میں بزنس کر کے دیا ہے، دوسرا جاپان میں ہے۔"

وہسکی پی کے وہ چہکنے لگا۔ "بھگوان نے سب کچھ دیا ہے مجھ کو۔"

اُس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی ہوئی ہماری باتیں سن رہی تھیں اور پیلے رنگ کی اُون سے ایک کارڈی گن بن رہی تھی۔

"ہنس مکھ پیاری بیوی۔" (شاردا موٹے، گل گوتھلے بچوں کی طرح مسکرانے والی اُس کی بیوی کارڈی گن بنتے بنتے مسکرائی اور اُس نے جڑاؤ کنگن والا ہاتھ اپنے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "میری منو اور گنوریہ (شاید اُس کی دونوں لڑکیوں کے نام تھے) اور ستری (یہ اُس کی بڑی لڑکی کا نام تھا، جس کی تصویر شاردا نے مجھے لاکے دکھائی ایک خوبصورت بے عقل لڑکی ایک موٹے تاجر کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں کے چہروں پر وہ حماقت بھری خوشی بھی تھی، جو صرف شادی کے دنوں میں نظر آتی ہے) اور میرا بڑا لڑکا سکھ داس جو فلپائن میں ہے۔ اور ہری داس جو جاپان ہے (شاردا نے مجھے ان کی تصویریں بھی دکھائیں، دونوں اپنے باپ کے پاکٹ ایڈیشن تھے پینتیس سال ہوئے میں ہانگ کانگ میں آیا تھا۔ دو سو ڈالر لے کر۔ آج دو کروڑ سے زیادہ کی جائداد میرے پاس ہے۔"

"تم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہو۔ ہانگ کانگ دو گھنٹے میں جا سکتا ہے۔"

"میں بیوقوف نہیں ہوں۔" اسرانی بولا۔ "اسی لئے تو میں نے اپنی فرم کا ہیڈ آفس فلپائن، منیلا میں کھول دیا ہے۔ سکھ داس کو اس کا انچارج بنا دیا ہے۔ اور باقی سب بندوبست ایسا کر رکھا ہے کہ میں بھی ہانگ کانگ سے دو گھنٹے میں جا سکتا ہوں۔" ایک عجیب مقدس مسرت آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے پیٹ پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ "میں بہت خوش ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔"

کھانا کھا کے ہم کافی پی رہے تھے۔ کہ کلاک نے دس بجائے۔ اسرانی کے منہ سے نکلا۔ "ارے" اور کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اور اس نے جلدی سے اپنا چہرہ اپنے

دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ شاردا جلدی سے دوڑی دوڑی دوسرے کمرے میں گئی۔ اور دوڑی دوڑی واپس آئی۔ اس کے ہاتھ نے تہہ در تہہ بہت سے رومال پکڑ رکھے تھے۔ شاردا نے جلدی سے وہ رومال اسرانی کے گھٹنے پر رکھ دیئے۔ میں نے دیکھا اتنے عرصہ میں اسرانی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ نہ صرف چہرہ بلکہ اس کی ہتھیلیاں بھی بھیگ گئی تھیں۔ جلدی وہ رومال لے کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ مگر آنسو تھے کہ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے اُبلتے ہی چلے آرہے تھے۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ رومال سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا "تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے خیال نہیں رہا۔"

"کیا خیال نہیں رہا؟"

"کہ وقت آگیا ہے۔"

"کون سا وقت؟"

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ مجھے اس دنیا میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بس اگر کوئی تکلیف ہے تو یہی۔ جوں ہی رات کے دس بجتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ کبھی گھنٹہ بھر کبھی دو گھنٹے کبھی تین گھنٹے میری آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"کیا معلوم! امریکہ تک ہو آیا ہوں ان آنکھوں کے علاج کے لئے۔ مگر کسی ڈاکٹر سے ٹھیک نہیں ہوا۔ کسی ڈاکٹر کو میری بیماری کا پتہ نہیں چل سکا۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"بس آنسو بہتے ہیں؟"

"اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟"

"نہیں، اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی!"

اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ اور آنسو اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اور وہ بار بار رومال لگا کر اپنی آنکھوں کو خشک کرتا تھا۔ اور آنسو اُن سے بہہ کر نکلتے چلے آرہے تھے۔ یکایک مجھے اس کا بھیگا گیلا آنسوؤں میں تر بتر چہرہ ایک ایسی لاش کا چہرہ دکھائی دیا، جو پانی میں ڈوبی ہو۔ پھر دُور کسی گہرے کنوئیں سے مجھے ایک لڑکی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"شاید یہ آنکھیں احتجاج کرتی ہیں۔"

"کیا؟ وہ آنکھیں پوچھتے پوچھتے میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں سمجھا نہیں۔"

"کچھ نہیں۔ یہ وہ بیماری ہے جسے تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔"

میں نے سر پہ ٹوپی رکھ کر اُسے سلام کیا۔ اور اسرائی اور اُس کی بیوی کو حیران و ششدر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

وہ قحبہ خانہ کی لڑکی اب ہنس رہی تھی۔

بُرے پھنسے

میں آسانی سے کسی دوست کی مصیبت میں پھنسنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن ایک دفعہ یہ ہوا کہ میرے دوست موتی رام نے مجھے چائے پر مدعو کر رکھا تھا، اور چونکہ اسی روز شام کو کچھ مہمانوں نے میرے ہاں آنے کی دھمکی دی تھی اس لئے میں نے موتی رام کی چائے کی دعوت جھٹ منظور کر لی اور اس کے گھر چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ وہاں جا کر ایک عجیب ماجرا دیکھا۔ مسٹر اور مسز رام دونوں باہر جانے کے لئے کپڑے پہنے ہوئے عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے اور ان کے چھ بچے ان کے آس پاس حیرت سے دم بخود ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور چائے کا کہیں دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے موتی رام؟ میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں دوست؟" موتی رام بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میرے ایک قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے، بے چارہ کولابے میں رہتا ہے جو یہاں سے پندرہ میل دُور ہے۔"

میں نے کہا "اب کولابے میں رہنے والوں نے ہمیشہ زندہ رہنے کا پٹہ تو لکھوا نہیں رکھا، موت وہاں بھی آسکتی ہے اور یہاں سے بیس میل دُور بھی۔ رہا رشتے دار کے مرنے کا افسوس تو وہ برحق ہے۔ رشتے دار مرتے ہی رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے رشتے دار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اب اس شہر بمبئی کو ہی لے لو۔ سُنا ہے یہاں ہر روز بیس ہزار آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے پچیس ہزار آدمی ہر روز ریل گاڑیوں میں بھر کر باہر سے آجاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کس کے آنے کا ماتم کیا جائے کس کے جانے کا افسوس . . . ."

"افسوس اس بات کا نہیں ہے" مسز موتی رام آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "کہ ان کا رشتہ دار مر گیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے آپ کو چائے نہیں پلا سکوں گی۔"

"کوئی بات نہیں بھابی جی۔" میں نے مسز موتی رام کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گلوبند کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میں کل آجاؤں گا چائے پینے کے لئے۔"

اتنا کہہ کر میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً موتی رام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکا۔ وہ میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "دوست! میں اس وقت ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ چھ بچوں کا ساتھ ہے۔ ساتواں پنگوڑے میں سویا پڑا ہے اور پُرسے میں اپنے ساتھ میں چھ بچوں کو نہیں لے جا سکتا اور پُرسے میں جانا بھی ضروری ہے، تم اس وقت میری مدد کرو۔ دو تین گھنٹے ہماری خاطر اس گھر میں ٹھہر کر ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کرو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ہم آٹھ بجے تک ضرور آجائیں گے۔"

مسز موتی رام نے مجھے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ جلدی سے بولیں "چائے تم خود بنا کے پی لینا۔ کچن میں سب کچھ رکھا ہے۔ فرج میں انڈے بھی ہیں۔ اور فروٹ بھی ہیں کچھ کھانے کا سامان بھی ہے۔ مٹھائی بھی ہے۔"

میں نے سوچا، آٹھ بجے تک تو میرے مہمان بھی میرے گھر پر میرا انتظار ضرور ہی کریں گے۔ چلو اُدھر چائے کی بچت ہو جائے گی، اُدھر مفت میں چائے مٹھائی، فروٹ سے اپنی تواضع رہے گی۔ تین گھنٹے یہاں آرام سے گزار لیں گے۔ اس میں مصیبت ہی کیا ہے پیارے؟ کبھی کسی دوست کے کام بھی آنا چاہیئے۔

چنانچہ میں نے ہاں کر دی اور وہ لوگ میرا شکریہ ادا کر کے اپنا گھر اور اپنے بچے میرے سپرد کر کے جلدی سے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے فوراً بعد میں نے گھر کی سب سے بڑی لڑکی پُشی (جس کی عمر دس سال کی تھی) سے کہا۔

"پُشی چائے تو پلاؤ۔"

"ابھی لاتی ہوں انکل" وہ مستعدی سے بولی اور دوڑی دوڑی کچن میں گئی، دوڑی دوڑی واپس آئی اور کہنے لگی "نعمت خانے میں تو تالا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جاتے سمے ممی غلطی سے تالا لگا گئیں۔ نعمت خانے میں ہی چائے دودھ سب بند ہے۔"

"تو فرج میں دیکھو۔"

"فرج بھی بند کر گئی ہیں!"

بڑا لڑکا بنٹو جس کی اصلی عمر آٹھ سال ہے اور جو بارہ سال کا معلوم ہوتا ہے اور بڑے تندرست ہاتھ پاؤں کا ہے۔ بڑے زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا "یہ تو ممی کی پرانی عادت ہے۔ باہر جاتے سمے ہمیشہ نعمت خانہ بند کر جاتی ہیں۔ مگر آپ فکر نہ کریں انکل۔ آپ کو چائے ضرور پلوائی جائے گی آپ آرام سے اس صوفے پر بیٹھیں۔ کوٹ اُتار کر مجھے دے دیجئے، میں اسے اندر کی الماری میں ٹانگے دیتا ہوں، پنکھا کھولے دیتا ہوں۔ گرمی کا موسم ہے۔ ٹائی کھول کر آرام سے بیٹھئے۔ ابھی چائے تیار ہوئی

جاتی ہے۔"

میں نے ٹائی ڈھیلی کی۔ کوٹ اتار کر بنٹو کو دے دیا۔ جوتے اتار کر پپو کو دیئے۔ چھڑی ٹلو کے ہاتھ میں تھما دی۔ ٹوپی ببلو کے حوالے کی اور خود چار سال کی مینا کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں بنٹو چائے کا سامان بازار سے لے آیا۔ پُشی نے چائے بنائی اور بڑے سلیقے سے مجھے پیش کی۔ چائے اور مٹھائی، کیک اور سموسے اور نمک پارے بھی۔ سب ہی کچھ تھا۔ ایک بات ہے۔ موتی رام کے بچے بڑے ہونہار اور سلیقے والے ہیں۔ بہت جی خوش ہوا۔

چائے کے بعد کچھ وقت آرام سے گزرا۔ پھر مینا نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے مجھ سے ایک کہانی سُنی۔ بنٹو نے حساب کے چند سوال مجھ سے حل کرائے اتنے میں اندر کے کمرے سے منّے کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً منّا جو پنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا۔ اور ابھی صرف ایک سال کا تھا جاگ گیا تھا۔ پُشی اسے وہاں سے لے آئی اور خود کچن میں منے کے لئے دودھ گرم کرنے لگی۔ منّا رونے لگا تو ببلو نے اسے جلدی سے میرے ہیٹ پر بٹھا دیا اور بولا "دیکھئے انکل منّا آپ کے ہیٹ میں بیٹھا ہوا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" سب بچے منّا کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے، منّا بھی انہیں دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اسے وہ ہیٹ جس میں وہ بیٹھا ہوا تھا بہت پسند آیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کے کونے پکڑ کر کھیلتا رہا۔ پھر وہ اسے کموڈ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ پُشی دوڑی دوڑی آئی اور منّا کو ہیٹ سمیت اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی تھوڑی دیر بعد منّا کو تو وہ نہلا دُھلا کر باہر لے آئی، مگر میرا ہیٹ وہیں چھوڑ آئی۔ تھوڑی دیر بعد ساتھ کے کمرے میں ببلو اور پپو کے لڑنے کی آواز آئی میں بھاگ کر گیا کہ دیکھوں ماجرا کیا ہے؟ دیکھا تو دونوں۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ببلو پپو سے کہہ رہا تھا "نکال چونی! نکال چونی! نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔!"

میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا اور ببلو سے پوچھا، کاہے کی چونی بیٹا؟ کاہے کی چونی

مانگ رہا ہے۔؟"

ببلو روتے روتے بولا "پپّو نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ یہ انکل کا بوٹ ہے، اس کا سینڈل نہیں بن سکتا۔ میں نے کہا بن سکتا ہے۔ وہ بولا بن سکتا ہے تو بنا کے دکھا۔ میں تجھے چوّنی دوں گا۔ میں نے بنا کے دکھا دیا، اب وہ چوّنی نہیں دیتا۔ تم ہی دیکھو انکل سینڈل بنا ہے کہ نہیں؟" اس نے مجھے میرا بوٹ دکھایا، میں نے گھبرا کر دیکھا۔ ببلو نے غالباً کسی بلیڈ یا قینچی سے میرے جوتے کی ٹو کو کاٹ دیا تھا۔ ایڑی کے اوپر کا چمڑا بھی تراش ڈالا تھا۔ بے چارے نے بڑی محنت سے میرے بوٹ کا سینڈل بنایا تھا۔ اور اس پر پپّو کی نالائقی دیکھئے کہ اسے چوّنی تک نہیں دے رہا تھا۔

خون میری رگوں میں جمنے لگا تھا۔ خوف اور غصّے سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے کہ اتنے میں پنکی مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی، بولی "انکل میں نے آپ کا ہیٹ دھو کر پریس کر دیا تھا۔" اتنا کہہ کر اس نے کوئی چیز میرے ہاتھ پر لا کر رکھ دی۔ یہ میرا فلیٹ ہیٹ تھا جو اب گاندھی کیپ بن چکا تھا۔ میں اس کی تہیں کھول کر اسے غور سے دیکھنے ہی والا تھا کہ زور کی چیخ مار کر ٹلّو نے میرے ہاتھ سے ہیٹ چھین لیا اور اُسے میری چھڑی کی نوک پر رکھ کر گھمانے لگا۔ سب بچے خوشی سے غالباً ہنسنے لگے۔ مینا خوشی سے قہقہے لگاتی ہوئی بولی "سرکس کا جادوگر" اتنے میں ببلو میاں میرا کوٹ لے کر میرے پاس آئے "سرکس کا کھیل ہوگا اب!"

"ٹھیک ہے سرکس ہی سہی ۔۔۔" میرا دل بیٹھنے لگا۔

"آپ جوکر ہیں!"

"بلاشبہ میں جوکر ہوں۔"

مینا میری گود میں بیٹھے بیٹھے تالی بجا کر بولی "آہا! انکل جوکر! انکل جوکر!"

بنٹو بولا "اب جوکر بنا ہے تو ٹھیک طرح میک اپ کرو انکل!"

"کس طرح کروں میک اپ؟ میں نے لرز کر پوچھا۔

ٹلو بولا" میں انکل کو جوکر بناتا ہوں۔"

ٹلو گھر کے اندر کے کسی کونے سے ایک پرانا غبارہ لایا۔ اس کا ایک حصّہ پھلا کر اس نے میری ناک کی نوک سے باندھ دیا۔ ببلو نے اپنے پینیٹ باکس میں سے لال رنگ کی روشنائی نکال کر میرے رخسار لال کئے بنٹو نے میرے ہونٹ کالے کئے۔ اب میں جوکر تھا اور بچے میرے چاروں طرف خوشی سے ناچ کو د رہے تھے۔ بنٹو نے میری ٹانگوں کے درمیان میری چھڑی رکھ دی اور سب بچے ہلا بول کر اس پر سوار ہوگئے چھڑی چرچرا کے ٹوٹ گئی اور میں بچوں سمیت فرش پر گر پڑا۔ ابھی گھٹنوں کے بل اٹھا بھی نہ تھا کہ منی نے تالی بجائی "گھوڑا گھوڑا" اور اچک کر مجھ پر سوار ہوگئی۔ اس کے سوار ہونے کی دیر تھی کہ ٹلو نے بھی ایک چھلانگ لگائی اور میری گردن پر آرہا پھر بنٹو اور ببلو بھی ایک دیوار سے جست لگا کر میری پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ اسے روز کا حملہ تھا کہ گھوڑا بیچ میں جھک گیا اور فرش پر گر پڑا۔ پھر دو تین گھونسے دھکے تکّے لگے۔ وہ ہیجم دھاڑ مچ گئی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب بچے الگ ہوئے تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ چہرہ بھوتوں کا سا، بال نچے گھسٹے، قمیص اور پتلون تار تار، کوٹ دھجیاں دھجیاں چہرے پر اَن گنت خراشیں۔ باقی بدن کا کیا حال تھا، یہ تو ایکسرے کروانے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔

گھڑی کا فیتہ الگ ہو کر ایک طرف کو لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ کلائی پر باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے اور ابھی تک وہ لوگ نہیں آئے تھے۔ حالانکہ آٹھ بجے تک آنے کو کہہ گئے تھے۔ بہر حال اب میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ایک پاؤں میں بوٹ، دوسرے میں سینڈل اور ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چھڑی لے کر اٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ ٹپّی نے بھاگ کر دروازہ کھولا، مسٹر اور مسز موتی رام تھے۔ آتے ہی مجھے دیکھ کر

خوشی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

"تو آپ بھی بچوں میں بچے بن گئے! واہ کیا جوکروں کی سی صورت بنا رکھی ہے آپ نے۔" مسز موتی رام چہکیں۔

غصہ تو مجھے بہت آرہا تھا، مگر کسی طرح پی گیا۔ اپنی کپکپاتی ہوئی آواز کو دباتے ہوئے دھیرے سے بولا "آپ لوگ پُرسہ دے آئے؟"

"نہیں بھائی صاحب۔" مسز موتی رام بولیں "جن کے ہاں ہم لوگ پُرسہ دینے گئے تھے وہ لوگ تو ملے ہی نہیں، اس لئے ہم لوگ پکچر دیکھنے چلے گئے۔"

"پکچر دیکھنے چلے گئے!" میں نے دل ہی دل میں دانت پیس کر کہا "اور یہاں یہ گت بن گئی۔" میں نے جلدی سے اجازت چاہی تو بنٹو میرے قریب آکر بولا "انکل یہ لیجئے سات آنے۔"

"سات آنے! کاہے کے سات آنے بیٹا؟"

"چائے کا سامان نہیں آیا تھا؟" بنٹو بولا "ممی نعمت خانہ بند کر گئی تھیں۔ میں آپ کے کوٹ کی جیب سے دس روپے نکال کر لے گیا تھا اس میں سے سات آنے بچے۔ یہ لیجئے۔"

مسز موتی رام خوش ہو کر بولیں "میرا بیٹا بنٹو حساب کا بڑا کھرا ہے، کبھی ایک پائی ادھر سے اُدھر نہیں کرتا۔ لے لیجئے نا! آپ ہی کے پیسے ہیں۔"

میں غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میرا خون اب کھولنے لگا تھا۔ اس وقت اگر میں ایک آتش فشاں پہاڑ ہوتا تو فوراً پھٹ پڑتا، مگر میں تو ایک مجبور انسان۔ میں نے سر جھکا لیا اور کچھ کہے بغیر فوراً ان کے گھر سے نکل گیا۔

اس دن سے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی کسی دوست کی مصیبت کے وقت مدد نہیں کروں گا۔ مگر مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

جب تک اس دنیا میں ہم لوگ ہوں گے اور درست بھی ہوں تو مصیبتیں تو آتی ہی رہیں گی۔
اور ہماری آپ کی طرح کے لوگ اس میں پھنستے ہی رہیں گے۔!

مٹّی کا تیل

صبح سے اسٹوو نہیں جل رہا تھا۔ پُرانا اسٹوو تھا۔ کسی کباڑیئے سے تین روپے میں خریدا تھا۔ دو سال سے نیا اسٹوو خریدنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ خواہش میں یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ آدمی اسے رکھ سکتا ہے وہ گھر، بیوی، ملازم، گاڑی رکھ سکے، نہ رکھ سکے۔ ان کی خواہش ضرور رکھ سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی خواہش رکھنے پر پابندی نہیں ہے۔ اس کے لئے کسی کوٹے پرمٹ یا لائسنس کی ضرورت نہیں۔ جتنی چاہیں خواہشیں رکھیں۔ کیسے خوش قسمت ہیں ہم لوگ کہ ہمیں خواہشیں کرنے اور رکھنے کی مکمل آزادی ہے۔!

جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ خواہش رکھنے کے سلسلے میں ہمارا ملک کتنا آزاد ہے، میں کچھ زیادہ ہی محب وطن ہو چلا ہوں۔ مجھے ان بدقسمت ملکوں کا خیال آتا ہے جہاں کے لوگ خواہشوں کے سلسلے میں بہت معذور ہو چلے ہیں۔ اور کوئی خواہش ہی نہیں رکھ سکتے.....

اسٹوو؟ اُن کے پاس پہلے سے موجود ہے ...... کپڑے؟ وہ بھی ڈھیروں موجود ہیں ......
ٹیلی ویژن؟ وہ بھی حاضر ہے ...... فریجڈیر؟ وہ بھی ایک کونے میں پڑا ہے .... گاڑی
گھر کے باہر کھڑی ہے ...... چاند؟ وہاں تک بھی پہنچ گئے ...... اب کیا کریں؟ کس کی خواہش
رکھیں بے چارے؟ مجھے ان لوگوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ کوئی ٹیکس ادا کئے بغیر اَن
خواہشیں رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ میرے پاس تو آج کل خواہشوں کا اتنا بڑا اسٹاک جمع ہو گیا ہے کہ سو
ہوں کہ انہیں کلیرنس سیل میں بیچ دوں مگر پھر سوچتا ہوں، انہیں خریدے گا کون؟ اس لئے یہ خو
بھی خواہش ہی رہے تو اچھا ہے۔

اسٹوو اٹھا کے نکڑ پر گیا۔ چھ آنے میں اسٹوو ٹھیک کرا کے لایا۔ پھر بھی اسٹوو نہیں جلا تو
معلوم ہوا گھر میں مٹی کا تیل نہیں ہے۔ مٹی تو بہت ہے، مگر اس کا تیل نہیں ہے۔ مٹی کے تیل
بوتل اٹھا کر اس کی تر و تازہ خوش بُو سے مشامِ جاں کو مہکاتا ہوا اپنی خوش رنگ خواہشوں سے کھ
ہوا، راشن والے کی دکان پر پہنچا تو معلوم ہوا مٹی کا تیل شام کے پانچ بجے آئے گا۔ بالعموم صبح
گیارہ بجے تین پہیوں والا ایک ٹریلر آتا ہے۔ اس ٹریلر میں پیلے رنگ کا ایک بڑا ڈرم رکھا ہوتا
جس کے نیچے ایک نلکی لگی ہوتی ہے۔ وہ ڈرم مٹی کے تیل سے بھرا ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی جا
کس تارِ بے برقی سے گھر گھر خبر پہنچ جاتی ہے اور مرد عورتیں بچے ملازم، مٹی کے تیل کی خالی بوتل
یا ڈبے یا چھوٹے پیپے یا کوئی اور برتن اٹھائے بھاگے بھاگے چلے آتے ہیں۔ تین پہیوں والے
ٹریلر کے گرد جمِ غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے۔ وہ دھینگا مشتی ہوتی ہے کہ آدمی اگر اس مجمع کو نہ دیکھے او
آنکھیں بند کر کے محض شور سنے تو اُسے گمان ہو کہ کتے لڑ رہے ہیں۔ مگر کتوں میں یہی تو ایک خو
ہے۔ وہ مٹی کے تیل کے لئے کبھی نہیں لڑتے۔ کبھی کبھی کتا بن جانے کو بہت جی چاہتا ہے۔
آزاد بے فکر زندگی ہے۔ جدھر چاہا چل دیئے۔ جس کوڑے کے ڈھیر پر چاہا منہ مار دیا۔ جس پر

پھونک لے۔ مگر ہم کتے نہیں ہیں انسان ہیں۔ تہذیب کے پیلے ڈرم کے گرد جمع ہیں اور مٹی کے تیل کی آرزو کرتے ہیں۔ بنیے نے جب یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ مٹی کا تیل پانچ بجے آئے گا تو خوشی کے مارے دل بلیوں اچھل گیا۔ پھر ایک دم دھک سے بیٹھ گیا کیوں کہ ابھی تو صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ مٹی کا تیل پانچ بجے آئے گا۔ جب تک کھانا کیسے پکے گا۔ گھر میں سب بھوکے ہیں۔

گھر آئے۔ مشورہ کیا تو معلوم ہوا ایک چیز ہوتی ہے۔ انگیٹھی۔ لوہے کی انگیٹھی موتی ہے۔ اس میں کوئلہ جلتا ہے۔ کوئلہ جلنے سے دھواں نکلتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں سے شعلہ بھی نکلتا ہے جو کھانا پکنے کے بعد بے ہوش ہو جاتا ہے، بلکہ اکثر اوقات تو کھانا پکنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ کھانا پکانے کے سلسلے میں بڑی کارآمد شے ہے۔

انگیٹھی کے بارے میں تمام ضروری اطلاعات فراہم کرکے لوہے کی انگیٹھی خریدنے کے لئے کباڑیئے کے یہاں گیا۔ اس نے بتایا "بلاشبہ میں لوہے کی سیکنڈ ہینڈ انگیٹھی خریدتا ہوں، مگر بیچتا نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں بیچتے ہو؟ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بولا "سیکنڈ ہینڈ انگیٹھی کو گاہک کے ہاتھ بیچنے سے وہ منافع نہیں ملتا جو اسے اسکریپ آئرن خریدنے والے کے ہاتھ بیچنے سے ملتا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ مجھے لوہے کی ایک انگیٹھی درکار ہے!"

"نئی خریدئے!"

گھر آکر پھر مشورہ کیا۔ نئی انگیٹھی خریدنے کے لئے جو پیسے کم پڑتے تھے، وہ لئے۔ بازار گیا۔ انگیٹھی خرید کے لایا۔ کچن میں نئی انگیٹھی رکھ کے کوئلے والے کی دوکان پہ گیا۔

وہ بولا "کوئلے والی لاری شام کو سات بجے آئے گی۔"

"شام کے سات بجے کیوں آئے گی؟"

"کیوں کہ وہ اس وقت نہیں آئے گی" کوئلے والے نے جواب دیا" مگر سات بجے جولاری آئے گی، اس میں سے آپ کو کوئلے نہیں مل سکیں گے۔ اُس نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

کیوں نہیں مل سکیں گے؟" میں نے پوچھا۔

کوئلے والا مسکرا کر بولا" میں اپنے سب گاہکوں کو پہچانتا ہوں۔ آپ پہلی بار میری دوکان پر آئے ہیں، میں اپنے مستقل گاہکوں کو کوئلہ دیتا ہوں۔"

اب بھوک نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ اس لئے میں نے اس سے پوچھا" مستقل گاہک بننے کی کیا شرائط ہیں؟"

وہ بولا" میری دوکان سے ایک روپے کا فارم ملتا ہے۔ پہلے اسے بھرو۔ اپنا نام، باپ کا نام۔ اپنا کام، اپنے کام کے دام۔ گھر کا پتہ، گھر کا کرایہ۔ سب معلومات ہمارے لئے اس میں لکھ دو۔ انکم ٹیکس دیتے ہو تو کتنا؟ اگر کسی بنک میں حساب ہے تو کتنا؟ مہینے میں کتنے کے کوئلے جائیں گے--!

میں نے کہا اپنے یہاں مہینے میں گیارہ روپے کا مٹی کا تیل جلتا ہے۔"

"تو.....؟" کوئلے والے نے حساب لگا کر کہا" تو بائیس روپے کے کوئلے چلیں گے۔ بائیس روپے پر دس روپے ہم اڈوانس لیں گے۔ باقی رقم کے لئے ضمانت!"

"ضمانت کاہے کے لئے؟"

"اگر تم مہینے کے بعد باقی رقم نہ دو تو؟ کوئلے والے نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میں گھر لوٹ آیا۔ گھر آکر پھر مشورہ کیا۔ مگر اب مشورے کی مدد سے گھر والے نکل چکے تھے سب کے سب بھوک سے اس قدر بے تاب تھے کہ مجھے ڈر محسوس ہوا۔ کہیں مجھے ہی کچا نہ کھا جائیں۔ لہٰذا روپے لے کر بھاگا بھاگا واپس کوئلے والے کی دوکان پر گیا۔ فارم بھرا، ایک روپہ

دیا۔ دوسرا فارم بھرا دس روپے ایڈوانس کے دیئے۔ ایڈوانس لے کر کوئلے والے نے رسید کے کاغذ پر اپنی مہر لگائی۔ عین اسی وقت یاد آیا کہ بچپن میں پڑھا تھا "اشرفیاں لٹیں، کوئلوں پر مہر" اس وقت سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئلوں پر مہر کیسے لگائی جاتی ہے۔ آج سمجھ میں آگیا۔

ایڈوانس لے کر اور اُسے سندوقچی میں بند کر کے کوئلے والے نے بتایا کہ ابھی ابھی کوئلے کے ڈپو سے فون آیا ہے کہ کوئلہ ختم ہو گیا ہے۔ جولاری آج شام سات بجے آنے والی تھی۔ وہ کل شام کے سات بجے آئے گی۔ یہ سُن کر دوسرا محاورہ یاد آیا "کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا" مگر آج کل منہ ہی کالا نہیں ہوتا ہے۔

بے نیل و مرام گھر لوٹا۔ ایک بج چکا تھا۔ میں نے گھر والوں کو تلقین کی کہ آج دوپہر کا کھانا کسی صورت میں نہیں پک سکتا۔ لہٰذا سب لوگ ایک ایک گلاس پانی کا پیئیں اور خدا کا شکر بجا لائیں۔ شکر بجا لانے کے لیئے پانی کا نل کھولا گیا تو پانی ندارد۔ معلوم ہوا آج کل میونسپلٹی کے نل سے پانی نہیں آتا۔ صرف آواز ہی آتی ہے۔

خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مگر یہ بھی میں نے محاورہ لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل خون کا گھونٹ بھی پیئیں تو کس کا؟ اپنا اس لیئے نہیں پی سکتے کہ رگوں میں خون ہی نہیں ہے۔ کسی دوسرے کا اس لیئے نہیں پی سکتے کہ دوسرے کا خون آج کل صرف بلڈ بنک سے دستیاب ہوتا ہے اور اس کے لیئے بھی کسی ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ چاہیئے۔ پرانے محاوروں کو بدلنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ یہی سوچتے سوچتے تقریباً بے حال سا ہو کر، فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا اور بیوی سے کہا "بجلی کا پنکھا کھول دو۔ سخت گرمی لگ رہی ہے۔" اس بے چاری نے پنکھا کھولا تو معلوم ہوا بجلی بند ہے۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجے سے لے کر چار بجے تک۔ جب گرمی سخت رہتی ہے۔ بجلی بند رہتی ہے۔ یوں غور کیا جائے تو ایک طرح سے یہ بہت اچھا ہے۔ بجلی کے پنکھے

سے تن آسانی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور آج کے بحرانی زمانے میں ہماری قوم کو سخت جانی کی سخت ضرورت ہے۔

جانے کیسے خالی پیٹ اور اس سخت گرمی کے عالم میں بھی اُونگھ آگئی۔ یکایک بیوی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ میرے سرہانے مٹی کے تیل کی بوتل لئے کھڑی ہے اور گھبرا کر کہہ رہی ہے۔ جلدی اٹھو۔ بھاگو!! ساڑھے چار بج گئے۔ پانچ بجے مٹی کا تیل آنے والا ہے۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور لڑکھڑا کر بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے گھر سے باہر نکل آیا۔ نکڑ سے گھوم کر دو تین گلیوں سے نکل کر بازار میں پہنچ گیا اور تیز تیز قدموں سے بنئے کی دوکان کی طرف لڑھکنے لگا۔

مجھے دوڑتے دیکھ کر اور ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل دیکھ کر اور بہت سے لوگ دوڑنے لگے۔ سب مٹی کا تیل آیا، مٹی کا تیل آیا، پکارنے لگے۔ کوئی ڈرم اٹھائے ہوئے تھا، کوئی پیپا، کوئی گھبراہٹ میں گھر سے پتیلی ہی اُٹھا لایا تھا۔ ایک صاحب جن کے پاس گھر جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ اپنے سر سے ٹوپی اُتار کے اسے الٹا اپنے ہاتھ میں لے کر بھاگے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "مجھے تیل دے دو۔۔۔۔ تیل۔۔۔۔۔ تیل۔"

بنئے کی دوکان سے ذرا فاصلے پر تین پہیوں کی ایک گاڑی آکے رُک گئی تھی۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں جمگھٹا لگ گیا تھا۔ ٹریلر کے قریب ایک اور لاری بھی آکے رُکی تھی۔ اتنی دور سے کچھ ٹھیک طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لوگ لاری، ٹریلر، سب گڈمڈ ہو رہے تھے۔ پولیس کا سپاہی بے کار میں سیٹی بجا رہا تھا۔ کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی، ہم میں سے پہلے پہنچنے والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مٹی کے تیل کا ٹریلر نہ تھا کسی انگریزی صابن بیچنے والی فرم کا ٹریلر تھا۔ جو بازار میں بنئے کی دوکان کے قریب ایک لاری سے ٹکرا گیا تھا۔ جب میں بھیڑ کے قریب پہنچا تو ایک صاحب اپنا خالی ڈبہ جھلاتے ہوئے بھیڑ

کے اندر سے نکلے، اور میری طرف دیکھ کر بڑی بے زاری سے بولے " ارے ادھر کوئی مٹی کا تیل نہیں ہے۔ صرف ایک آدمی ایکسیڈنٹ سے مر گیا ہے "

ہاتھی دانت کا ٹاور

نوبل پرائز یافتہ شولوخوف میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے ہیں مگر کبھی کبھی وہ بیڈ قدامت پرستی کی بات کر جاتے ہیں حال ہی میں ان کا ایک بیان چھپا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ادب کا میدان دراصل مردوں کا ہے۔ اور یہ کہ ادب عورتوں کے بس کی چیز نہیں۔ اب وہ ہوتے اگر ہندوستان میں تو ہم ملاتے انہیں اردو کی عصمت چغتائی سے، رضیہ سجاد ظہیر سے، قرۃ العین حیدر سے، سلمیٰ صدیقی سے، جیلانی بانو سے۔ ہندی کی مہادیوی ورما سے، کملا چودھری سے، منو بھنڈاری سے، پنجابی کی امرتا پریتم اور پریم حبیب کور سے — پھر یہ عورتیں جو اپنی اپنی زبان میں صفِ اوّل کی ادیب ہیں۔ خود سمجھ لیتیں شولوخوف صاحب سے!— یا اگر وہ ہوتے جرمن میں تو انا سیغرز سے مڈبھیڑ ہو جاتی ان کی، جو موجودہ دور کے جرمن ادیبوں میں صفِ اوّل کی ناول نگار مانی جاتی ہیں۔ یا وہ اگر ہوتے جین آسٹن یا ایملی برانٹے

کے عہد میں یا اس سے بہت پہلے مشہور شاعرہ سیفو کی زندگی میں تو وہ جینا دوبھر کر دیتی ان کا۔ دراصل افزائش نسل کے اہم مسئلے سے عورتوں کو فرصت ہی کب دی گئی کہ وہ کسی دوسرے کام میں اپنی پوری توجہ دے سکیں۔ پھر انہیں اس قدر پچھڑا رکھا گیا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح علم و ادب کے میدان میں بھی وہ زیادہ تعداد میں اپنے جوہر نہ دکھا سکیں۔ تو اس پر کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ اور ان پر طعنہ زنی کرنے کا تو موقعہ ہی نہیں ہے۔

میں نے شو تو خوف اور عورتوں کا ذکر اس لئے کیا کہ کہانی کی کہانی بیان کرنے کے سلسلے میں ان کا ذکر بہت ضروری تھا۔ بہت سے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانے کا فن بھی سب سے پہلے عورت نے شروع کیا۔ بعد میں مرد اپنی دھاندلی اور کھیل بازی سے اس پر سبقت لے گئے۔ مگر اس امر پر بیشتر سائنسدان اور محقق متفق ہیں کہ کہانی کہنے کے فن کو سب سے پہلے عورت نے رواج دیا۔ کھیتی باڑی کی طرح شاید اس امر سے آپ بھی واقف ہوں گے کہ کھیتی باڑی کرنا انسان کو سب سے پہلے عورت نے سکھایا۔ جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا تو مرد زیادہ تر شکار کے لئے چلے جاتے تھے اور اس وقت شکار کھیلنا آج کے شکار کی طرح آسان بھی نہ تھا۔ نہ بندوق تھی ان دنوں، نہ رائفل نہ کارتوس۔ تیر کمان بھی بعد کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے انسان کے لئے کسی جنگلی جانور کو مارنا اور اس کا گوشت حاصل کرنا جان جوکھم کا کام تھا۔ کئی بار خود اپنے دام میں صیاد آجاتا تھا اور کسی کا گوشت حاصل کرنے کی بجائے خود اس کے کھانے کا گوشت بن جاتا تھا ادھر گھر پر یا غار میں بیوی بچے بھوکے ہیں۔ ایسے عالم میں عورتوں نے وہ پودے دریافت کئے جن کے بیج کھا کر زندہ رہا جا سکتا تھا۔ عورت نے مرد کو نہ صرف دانہ گندم کھانے کی ترغیب دی بلکہ اسے دریافت بھی خود ہی کیا۔ چاول بھی عورتوں کی دریافت ہے۔ پھر ان پودوں کو پتھر کے ہل یا کسی جنگلی جانور کی ہڈی سے زمین کھود کر ان

کے بیج سے نئے پودے اُگانا، یہ سب سے پہلے عورتوں نے دریافت کیا۔ آج کل کے کسان کھیت میں ہل چلاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اپنی عورت کو روٹی کھلا رہا ہے حالانکہ روٹی پکا کر کھلانے کا فن بھی عورتوں کی ایجاد ہے۔

آپ نے سب سے پہلی کہانی نانی اماں سے سُنی ہو گی یا دادی اماں سے۔ یا اپنی ماں سے آج سے ہزاروں سال پہلے کی کہانی یعنی۔ سب سے پہلی کہانی بھی اسی طرح کہی گئی تھی۔ رات کے سناٹے میں اندھیرے کے خوف کو مٹانے کے لیئے، بچے کے اندر زندگی کے خوش آئند تصور کو جگانے کے لئے۔ ماں کی مہربان آغوش میں سلانے کے لئے۔ اسی طرح۔ لوری، گیت، شاعری، اور کہانی کا آغاز ہوا۔ ہیجوف۔ تسولوخوف۔ باپاساں۔ مام۔ پریم چند بعد میں آئے پہلے تو ایک عورت ہی آئی تھی۔ آج کی بھی کوئی کہانی عورت۔ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی دلچسپ سمجھی جاتی ہے۔

جس طرح کھیتی باڑی کا فن عورتوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک پیچیدہ مرکب عمل بن چکا ہے اس طرح سے کہانی ماں کی لوری اور پرستانی تصورات کی داستان سے آگے بڑھ کر زندگی کی تفسیر بن گئی ہے۔ اور بے حد پیچیدہ اور مرکب ہو گئی ہے۔

بہت عرصہ تک کہانی کا فن ایشیا میں بھاٹوں کے سپرد رہا اور یورپ میں (TROUHAD-OURS) کی تحویل میں رہا۔ یہ آوارہ گرد جہاں گرد و نغمہ گو مختلف قصے کہانیوں کو شعری جامہ پہنا کر راگ میں ڈھال کر ساز پر سناتے تھے۔ اُن دنوں کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ شعر۔ نغمہ اور کہانی ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتے تھے۔ اور کیا کیا دلچسپ قصے ہوتے تھے قصے سُورماؤں کے (KNIGHT) کی بہادری کے، الف لیلا کے۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کے، عاشقوں اور آشفتہ مزاجوں کے۔ ان مافوق الفطرت، دیوؤں کے جو نازک بدن حسیناؤں کو کاٹھ کے

پنجرے میں یا ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیتے تھے، اور "مانس گندھ، مانس گندھ" کہتے ہوئے انسانوں کے شکار کی تلاش میں چل دیتے تھے۔

آج کہانی اس زمانے سے بہت دُور نکل آئی ہے۔ براہ راست اس کا رشتہ شعر سے، نغمے سے، راگ اور ساز سے کٹ گیا ہے۔ اب کہانی نثری زبان میں ڈھل گئی ہے۔ لیکن آج کی کہانی میں شعریت، اندرونی نغمگی اور ایک باطنی راگنی اور اس کی لَے سے عاری نہیں ہو سکتی جو ادب اور فن کے ہر شعبے میں ایک اچھی تخلیق کو ایک بُری تخلیق سے ممتاز کرتی ہے۔ آج کی کہانی بھی اسی پہلے مقصد کو پورا کرتی ہے جس کی ضرورت ماں نے اپنے بچے کے لئے سمجھی تھی یعنی اندھیرے کے خوف کو مٹانے کے لئے اور زندگی کے خوش آئند تصور کو انسان کے دل میں جگانے کے لئے آج بھی کہانی استعمال کی جاتی ہے۔ اور آگے بھی کی جائے گی۔ اور اس کا صحیح مصرف یہی رہے گا۔ گو انسان بہت ترقی کر گیا ہے مگر آج بھی وہ جنگل میں رہتا ہے۔ چاروں کھونٹ شہر بسے ہیں اور ان میں دیواروں کے جنگل اُگے ہیں۔ اور دیو زاد طاقتیں زندگی کی حسین نازک، نفیس قدروں کو کاٹھ کے پنجرے میں قید کر کے یا جیب کی کسی ڈبیہ میں ڈالے مانس گندھ کرتی ہوئی انسانوں کے شکار کی تلاش میں گھوم رہی ہیں۔ قبیلوں، قوموں اور ملکوں کے سردار، بادشاہ اور سلطان گئے۔ تو تیل کے بادشاہ آ گئے۔ لوہے کے شہنشاہ اور جُوٹ کے سلطان .... بھاٹ آج بھی اگر قصیدہ گو منہیں ہے تو اس کا سر قلم ہو گا۔ آوارہ گردوں، آشفتہ مزاجوں، عاشقوں کے لئے کہانی کہنا آج بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ پچھلے زمانے میں تھا۔

ادھر کہانی کے میدان میں کچھ نئے لوگ آئے ہیں — یہ لوگ بظاہر نئی نسل کے ہیں لیکن دراصل اپنے جیسے ہیں۔ بالکل ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں، اسی طرح شیو کرتے ہیں۔ اسی زبان میں

گفتگو کرتے ہیں، جس میں ہم کرتے ہیں۔ اسی طرح روزی، روٹی، ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بالکل عام لوگوں کی طرح اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے خوشامد بھی کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں ترتیب ہے، تنظیم ہے، ابلاغ ہے، مقصد ہے، کوئی منزل ہے۔ کوئی جادہ ہے۔ اور اگر کہیں پر کچھ نہیں ہے تو ادب کے میدان میں نہیں ہے، وہ زندگی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی مقصد کو روا رکھتے ہیں صرف ادب میں کسی مقصد کے قائل نہیں۔ آپ جب اُن سے بات کریں گے تو ان کی گفتگو بالکل ٹھیک ٹھیک آپ کی سمجھ میں آئے گی مگر جب یہ کہانی لکھیں گے تو آپ کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا سوائے ایک مجہول چیستان کے۔ وہ کافی ہاؤس جانے کا راستہ جانتے ہیں۔ مگر اپنی کہانی کا راستہ انہیں معلوم نہیں۔ انہیں اپنی ملازمت کا مقصد معلوم ہے اپنی کہانی کا نہیں۔ جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو دو ٹانگوں کے سہارے قدم اٹھاتے ہوئے جاتے ہیں مگر اپنی کہانی میں سر کے بل رینگتے ہیں۔ اور اسے آرٹ کہتے ہیں — میں انہیں کہانی کار نہیں شعبدے باز کہتا ہوں۔ یہ لوگ رنگین الفاظ کے فیتے اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔ اپنی ٹوپی سے خرگوش، آپ کی جیب سے انڈا اور آپ کو حیران و ششدر چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ بعد میں آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی جیب کی آخری چونی بھی شعبدے باز کی نظر ہو گئی اور ملا کچھ نہیں۔ اور آپ کو کچھ ملے بھی کیوں — ؟ کیوں کہ یہ لوگ آپ سے کچھ لینے کے قائل ہیں۔ عوض میں کچھ دینے کے قائل نہیں ہیں۔ سماج میں آپ جانتے ہیں سب لوگ کچھ کام کرتے ہیں۔ اور اس کام کی کوئی ترتیب ہوتی ہے، کوئی تنظیم ہوتی ہے۔ اور اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس کام سے کسی کی کوئی خدمت سرانجام دی جاتی ہے۔ اور اس کا معاوضہ بھی ملتا ہے۔ مگر یہ نئے کہانی کار سماج کے بس اس حد تک قائل ہیں۔ کہ سماج ان کو کچھ دے اور برابر دیتا رہے۔ اس کے عوض میں یہ سماج کو کیا دیتے ہیں۔ اس کی ان کو کوئی پرواہ نہیں، نہ اس قسم کی باتوں کے

قائل ہیں۔ کہانی کہتے یہ بالکل بے مقصد ہوں گے لیکن کہانی کے چھپتے ہی فوراً مقصد کے قائل ہو جائیں گے۔ یہی معاوضے کے شہرت کے، عزت کے اور تعریف کے یعنی ان تمام مقاصد کے جن کے لئے اکثر عام آدمی حیران و سرگرداں رہتے ہیں۔

میں نے اپنی بوڑھی نانی اماں سے کہانیاں سُنی ہیں۔ یا پھر اپنی ماں کی آغوش میں۔ اس لئے میری کہانی کا فن بھی اتنا ہی پُرانا ہے۔ یعنی کہانی سننے والی کو بھی کہانی کی لذت ملے۔ رات موت اور اندھیرے کا ڈر دُور ہو۔ زندگی کا خوش آئند اور روشن تصورات جاگیں۔ کیونکہ ہم سورج کے بیٹے ہیں۔ اگر ہم تاریکی اور اندھیرے کے بیٹے ہوتے تو ہماری آنکھیں نہ ہوتیں اور ہماری حسیات کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔ مگر ہم سورج کے بیٹے ہیں۔ روشنی ہمارا وطن ہے، چاندنی ہمارا بدن ہے۔ دھوپ ہماری غذا ہے۔ ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں اور محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اندھے نہیں ہیں۔ اس دنیا میں آنکھوں سے زیادہ مقدس کوئی شے نہیں ہے۔

اس لئے میری کہانیاں آنکھیں رکھتی ہیں۔ وہ راستہ دیکھتی ہیں، اور ارد گرد کے دلچسپ مناظر۔ ہر لحظہ نگاہ ادھر رہتی ہے، جہاں جانا ہے، جسے منزل، مقصد، نصب العین کچھ بھی کہیئے میں اسے ہاتھی دانت کا ٹاور کہتا ہوں۔ سو سال سے میرے سپنوں کی شہزادی اس ٹاور میں سو رہی ہے۔ ایک ظالم دیو نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ اور وہ سو سال سے سو رہی ہے۔ اس کے آس پاس سو سو میل تک کا سارا جنگل سو رہا ہے۔ اور میری نانی اماں نے مجھے بتایا تھا — کہ جو کوئی بھی اس گھنے جنگل کو عبور کر کے اس ٹاور کا دروازہ توڑ کر اس شہزادی کی آنکھوں پر بوسہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ شہزادی اسی لمحے جاگ جائے گی اور اس لمحے سارا جنگل جاگ جائے گا۔ اور چاروں طرف روشنی، خوشی اور خوشحالی پھیل جائے گی۔

کیا یہ کہانی واقعی اتنی پرانی ہے کہ آج کے حالات پر منطبق نہیں ہوتی؟ کیا آج ہاتھی

دانت کے ٹاور میں کوئی شہزادی نہیں سوتی ؟ کیا آس پاس سو سال یا کئی سو سال سے کوئی جنگل سویا ہوا نہیں ہے ؟ تاریکی میں ... ڈر میں خوف اور ہراس میں - نا امیدی کے اندھیرے میں اور موت کے بھیانک سایوں میں جنہوں نے زندگی پر سحر کر کے اس معصوم شہزادی کی آنکھوں میں نیند بھر دی ہے -

میں اُن احمقوں میں سے ہوں جو اس تاریک گھنے جنگل کو عبور کر کے ہاتھی دانت کے ٹاور کا دروازہ توڑ کر سوئی ہوئی شہزادی کی آنکھوں پر بوسہ دینے کی خواہش رکھتے ہیں -